قیمت : -/10 روپے

مئی 2009

ماہ نامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

محکمہ اعلیٰ تعلیم، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

قومی اردو کونسل کی اہم مطبوعات

کلیات سراج اورنگ آبادی

مرتب: عبدالقادر سروری

سراج اورنگ آبادی دکن کا وہ آخری بڑا شاعر ہے جس کی شاعری دکن اور شمال کی زبان کے بیچ احساس دوئی کو ختم کرتی ہے۔ انھوں نے چوبیس سال تک کے شعری سفر میں جو کچھ کہا اس میں سے دستیاب شدہ 508 غزلیں، 11 مثنویاں، 9 رباعیاں، ایک قصیدہ، 5 مستزاد، ایک ترجیع بند اور ایک مناجات اس کلیات میں شامل ہیں۔ اردو شعر و ادب میں سراج کی قادر الکلامی مسلّم ہے، ان کے کلام کا انتخاب اردو دنیا کی تقریباً تمام درس گاہوں کے نصابات میں شامل ہے۔ قومی اردو کونسل نے ''کلیات سراج'' کو نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔

صفحات: 732، قیمت: -/138 روپے

کلیات سعادت حسن منٹو (پہلی جلد)

مرتب: پروفیسر شمس الحق عثمانی

سعادت حسن منٹو بیسویں صدی کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے اردو ادیبوں میں سے ہیں۔ کونسل نے ایک بڑے منصوبے کے تحت ان کی تمام تحریریں جن میں افسانے، ریڈیو ڈرامے، فیچر، مضامین، خاکے وغیرہ شامل ہیں، شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ پہلی جلد میں ''آتش پارے''، ''منٹو کے افسانے'' اور ''دھواں'' کے افسانے شامل ہیں۔ ساتھ میں اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔

صفحات: 565، قیمت: -/285 روپے

دکنی لغت

مرتب: سیّدہ جعفر

دکنی شعر و ادب کی تفہیم، ہماری ادب فہمی کا ایک اہم پہلو ہے۔ پروفیسر سیّدہ جعفر نے، جو اردو زبان و ادب کی تاریخ پر عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ دکنیات کا بھی پاکیزہ ذوق رکھتی ہیں، اس لغت کی تدوین و ترتیب میں دکنی الفاظ، محاورات، ضرب الامثال، روزمرہ، تکیہ کلام اور ان کے معانی کی مختلف جہات کا احاطہ کیا ہے۔ ساڑھے پانچ سو برس قدیم ان دکنی الفاظ کا صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنا اس لیے ناگزیر ہے کہ زیر اور زبر سے معنی میں بہت تبدیلی آجاتی ہے۔ طلبہ و اساتذہ کی اسی ضرورت کے پیش نظر قومی اردو کونسل نے حال ہی میں یہ لغت شائع کی ہے۔

صفحات: 521، قیمت: -/590 روپے

آزادی کے بعد اردو نظم (ایک انتخاب)

مرتبین — شمیم حنفی، مظہر مہدی

''آزادی کے بعد اردو نظم'' آزادی کے بعد کی اردو نظموں کا ایک جامع انتخاب ہے جس میں 67 نمائندہ نظم نگاروں کی 245 نظمیں شامل ہیں۔ تمام نظمیں اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخط میں پیش کی گئی ہیں اور فٹ نوٹ میں مشکل الفاظ و تراکیب کے معنی بھی دیے گئے ہیں جن سے ہندی اردو کے قارئین ایک ساتھ استفادہ کر سکتے ہیں۔

صفحات: 758، قیمت: -/384 روپے

جدید — ہندی اردو لغت (دو جلدوں میں)

مرتب: پروفیسر نصیر احمد خاں

تکنیک اور ترتیب و تقسیم کے اعتبار سے ''جدید — ہندی اردو لغت'' اپنی نوعیت کی واحد لغت ہے جس میں قدیم و جدید ہندی کے الفاظ، ان کے تلفظات، ماخذ اور نحوی زمروں کے علاوہ معنی و مفہوم کو اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخطوں میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ماہر لسانیات پروفیسر نصیر احمد خاں کی مرتب کردہ یہ لغت ایک مفید، کارآمد اور سنجیدہ کاوش ہے جو اردو اور ہندی کے طلبہ کی بیشتر ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔

صفحات: 3286 (دو جلدیں)، قیمت -/1640 روپے (دونوں جلدیں)

آبشار اور آتش فشاں

مصنف: فضیل جعفری

فضیل جعفری ہمارے عہد کے معتبر ناقد اور ممتاز شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ''آبشار اور آتش فشاں'' ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں 11 مضامین شامل ہیں۔ ان کی یہ تنقیدی تحریریں ادب پاروں پر نہیں بلکہ اپنے عہد کی تنقیدوں اور نقادوں پر ہیں۔ اردو ادب کی تنقیدی تاریخ میں ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت پر بہت بحثیں ہوئی ہیں اور تائید و تردید میں مزید تشخیص اور دلائل کا سلسلہ جاری ہے۔ اس بحث کی تفہیم میں فضیل جعفری کی یہ کتاب قاری کے ذہن کو نئی روشنی عطا کرتی ہے۔

صفحات: 368، قیمت: -/160 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب %45 اور %40 کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

ماہنامہ

اردو دنیا نئی دہلی

جلد-11، شمارہ-5، مئی 2009

مدیر: ڈاکٹر ابوبکر عباد

اعزازی مدیر: مخمور سعیدی

ناشر اور طابع:
پی. پی. او. قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: شہناز اختر

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا،
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک-1، ونگ-6
آر. کے. پورم نئی دہلی- 066 110
فون: 26103381, 26103938
فیکس: 26179657 26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urduduniyancpul@yahoo.co.in
urducouncil@gmail.com

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر. کے. پورم نئی دہلی-110066
فون: 26109746, 26169416

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات .... قارئین کے خطوط 2
ہماری بات .... ادارہ 4

زبان اور تعلیم
● اردو—انگریزی لغت مجتہدی .... اشرف رفیع 5
● اردو زبان اور علاقائی بولیاں .... نسیم احمد نسیم 8

ادب اور تاریخ
● الٰہ آباد کا ادبی ماحول: منظر اور پس منظر .... علی احمد فاطمی 12
● تنقید کا منصب .... ابوبکر عباد 17
● دہشت کی غزل .... معید رشیدی 19
● پتھر بولتے ہیں .... محمد یحییٰ جمیل 27

سائنس اور ٹیکنالوجی
● انٹرنیٹ اور اردو .... ایم مبین 30
● بجلی .... مدحت لقمان 32

کیریئر
● بیرونی ممالک میں تعلیم .... چودھری نوازش مہدی 35
● ای لرننگ .... خان قمر الزماں 37

روبرو
● صارفیت اور مادیت کے خطرناک پہلو .... رامسے کلارک/ ترجمہ: معید الرحمٰن 38

ہماری مطبوعات سے
● اردو ادب اور انقلاب 1857 .... سید احتشام حسین 41
● بہادر شاہ ظفر .... اسلم پرویز 45

اردو خبرنامہ .... ادارہ 52
تبصرہ و تعارف 69
● فکر و فن .... رغبت شمیم
● بجلی کی کہانی .... عبدالرب
● 1857: جنگ آزادی کا درخشاں باب .... ابوظہیر ربانی
● مولانا عبدالسلام ندوی: ماہر قرآنیات وادبیات .... محمد جابر زماں
● لاگ لپیٹ کے بغیر .... ممتاز الحق
● مثنوی: جہاں دار شاہ و شہزادی حور .... درخشاں زریں
● بے تیشہ .... فیاض احمد وجیہہ
● موج شمیم .... عبدالرشید راشد اعظمی
● دیگر کتب .... ادارہ

بچوں کا گوشہ
● انوکھے معمار .... شمیم احمد 78

آپ کی بات

■ **محمد یعقوب اسلم، 15@ نگر، پدور، وانم باڑی**

اپریل کا "اردو دنیا" ملا۔ "ہماری بات" میں آپ نے اردو زبان کی مکمل تاریخ کا احاطہ کرتے ہوئے آخر میں اردو والوں کو جو صلاح دی ہے وہ بڑی اہم ہے۔ اگر اردو والوں میں پچاس فی صد بھی اس پر عمل کرنے لگیں تو اردو کا مستقبل تابناک ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر شاہد پٹھان نے حلقۂ ارباب ذوق کے ادبی و انتقادی تصورات کا جائزہ لیتے ہوئے کئی نئے گوشوں کی نقاب کشائی کی ہے۔ اس معرکہ آرا موضوع کو چند صفحات میں قید کر کے انھوں نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ محمد سراج عظیم کا "ہندستان کی پہلی خاتون ڈاکٹر" معلوماتی مضمون ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔

حقیقت یہ ہے کہ "اردو دنیا" صوری و معنوی دونوں اعتبار سے دن بہ دن نکھرتا جا رہا ہے۔

■ **ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، شعبۂ اردو، ٹی ایم بھاگلپور یونیورسٹی، بھاگلپور**

محترم ابوبکر صاحب کے ادارت کی ذمہ داری سنبھالتے ہی "اردو دنیا" نے روپ رنگ بدل لیا ہے۔ اپریل کا شمارہ نظر کو بھاتا ہے۔ ذہن میں روشنی بھرنے کے لیے امام اعظم، صادق، پردیپ جین، سرور الہدیٰ، فیاض رفعت، شاہد پٹھان، ملک زادہ جاوید، ارشاد عالم اور فرزانہ اسد کے مضامین اہمیت کے حامل ہیں۔ دیگر تخلیقات سے بھی استفادہ کیا جائے گا۔ "اردو دنیا" میں ہمیشہ نئی معلومات سے بھرپور اور معیاری تخلیقات شائع ہوتی رہی ہیں۔ تبصرے بھی تفصیلی ہوتے ہیں اور اداریہ تو اہم ہوتا ہی ہے۔

■ **قیصر اقبال، شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مولا دو پور، مونگیر، (بہار)**

مونگیر میں "قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان" اور رحمانی فاؤنڈیشن مونگیر کے اشتراک سے 22، 23 اور 24 جنوری کو ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کی نسبت سے دوسری بار ایک کامیاب سیمینار کا انعقاد ہوا، مشاعرے ہوئے اور اردو کے ایک زندہ زبان ہونے کا احساس جاگا۔ کونسل کے بک اسٹال پر اہم دستاویزی کتب کے علاوہ فروری کا ماہ نامہ "اردو دنیا" بھی میسّر آیا۔ رسالے کے معیار اور وقار کو دیکھ کر خوشی ہوئی کہ حسب سابق یہ اب بھی خوشنما اور سربلند ہے۔

اردو اسلوبیات اور لسانی پیش رفت کے واسطے سے اب مرزا خلیل احمد بیگ کی حیثیت گوپی چند نارنگ کی زبان میں ایک CANON جیسی ہوتی جا رہی ہے۔ جناب مجتبیٰ حسین کی تحریر "ٹیکساس میں اردو کی اساس" تو ظرافت اور بذلہ سنجی پر ہے مگر موصوف نے جن حقائق کو پیش کیا ہے وہ اردو کے تعلق سے بہت خوش آئند اور حوصلہ افزا ہیں۔ کاش کے ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں میں بھی اردو/ ہندی کا ایک مشترکہ شعبہ قائم ہو جائے اور ٹیکساس یونیورسٹی کے طلبہ کی طرح یہاں کے طلبہ بھی دیوناگری اور اردو رسم الخط لازمی طور پر جان لیں تو بہت سے مسئلے اپنے آپ حل ہو جائیں اور یگانگت کی فضا قائم ہو جائے۔ مہاتما گاندھی کی دوررس نگاہ آنے والے خطرات کو محسوس کر چکی تھی اس لیے وہ "ہندوستانی" یا اردو ہندی کی مشترکہ شکل کو سامنے لانا چاہتے تھے۔

"یادرفتگان" کے تحت جناب مظہر امام اور جناب مخمور سعیدی نے رفعت سروش کو مناسب خراج پیش کیا ہے۔ وارث علوی نے عادل منصوری کی شاعری پر مناسب روشنی ڈالی ہے اگر مرحوم کی گجراتی شاعری کے کچھ ٹکڑے ترجموں کی مدد سے شامل کر دیے جاتے تو اردو والوں کے لیے دلچسپی کا باعث ہوتا۔

"ترجمہ، تبصرہ اور تعارف" اردو دنیا، کا اہم گوشہ ہوتا ہے اور یہاں کچھ تفصیل سے باتیں ہوتی ہیں جو طمانیت بخشتی ہیں اور کتاب و صاحب کتاب کی واضح صورت سامنے آ جاتی ہے۔ اس شمارے میں عبد الرب، احمد کفیل اور معید رشیدی تینوں کی تحریریں سیر حاصل ہیں۔ اداریے میں آپ نے یک قطبی طاقت کی جانب واضح اشارہ کیا ہے۔ اس کے استحصالی رویے نے تیسری دنیا کو پریشان کر رکھا ہے لیکن "ہر کمالے را زوال" تو ہونا ہی ہے اور پھر ظالم کی عمر کوتاہ بھی تاریخ کا حصہ بنتی آئی ہے۔ ہٹلر کی مثال بہت پرانی نہیں ہوئی ہے۔

■ مارچ کا شمارہ پر وقار مشمولات کے ساتھ سامنے آیا۔ یہ حقیقت ہے کہ "اردو دنیا" نے وقت کے بدلتے مزاج اور جدید تقاضوں کو بخوبی سمجھ لیا ہے اور اسی اعتبار سے مواد فراہم کر رہا ہے۔

مولانا آزاد کی زندگی کا ایک بڑا حصہ کلکتے میں گزرا۔ وہ وہاں امام عیدین بھی رہے۔ ان کی زندگی میں ہی معترضین اور مخالفین نے ان کے خلاف الزامات اور تہمتوں کا بازار گرم کیا لیکن مولانا نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور تمام باتیں ہوا کے بہاؤ میں اڑ گئیں یا یوں کہیے کہ ان کی دینی اور وطنی خدمات نے سب کے منہ بند کر دیے۔ پھر آج گڑے مردے کیوں اکھاڑے جا رہے ہیں؟ کیا ایسا کر کے آج کے نام نہاد اور موقعہ پرست حضرات اپنی شخصیت کو باوزن کرنا چاہتے ہیں۔

سلمان غازی کا مضمون "اردو ہے جس کا نام" دلچسپ اور وقیع ہے مگر ان کا یہ کہنا کہ ہمالے والے قاعدے میں اسم خاص کو بدل دینا صحیح نہیں ہے، مستند نہیں ہے۔ مولانا آزاد نے پونا کو پونے لکھا ہے اور غالب نے بھی "کلکتے" استعمال کیا ہے۔ ڈھونڈنے پر ڈھیر ساری مثالیں مل سکتی ہیں۔ ہاں غازی صاحب کا یہ جواز درست ہے کہ جب لفظوں کو معرّب کیا جا سکتا ہے تو مورّد (Urduised) کیوں نہیں۔ واضح رہے کہ ہندی والے اردو کے کثیر الفاظ کا بڑی تیزی سے ہندی کرن کر رہے ہیں۔

جمیل مظہری نے علامہ اقبال سے استفادہ کرتے ہوئے ان کی نظم "ایک آرزو" کے مدّ مقابل "شاعر کی تمنا" اور دیگر کئی عمدہ اور رواں نظمیں لکھی

ہیں۔ "آب وسراب" بھی اقبال کے فلسفۂ خودی کے انداز میں ایک کامیاب کوشش ہے۔ جمیل مظہری کی دلکش سلیس اور رواں نظمیں بار بار پڑھے جانے کا تقاضا کرتی ہیں۔ "ذرو خدا سے ذرو مجھے یاد نہ آؤ" اپنے وقت کی زبان زد نظم رہ چکی ہے اور اس نے نوجوان اور حساس دلوں کو بہت متاثر کیا تھا۔ اب بھی اس کی تازگی محسوس کی جاسکتی ہے۔

وناینک پرشاد طالب بنارسی کا تحریر کردہ اردو ڈراما "لیل ونہار" کا پلاٹ ممکن ہے لاطینی ناول "Day and Morning" سے ماخوذ ہو مگر درج قصے میں شیکسپیر کے Hamlet کا انداز بھی واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ مکالمے کے جو چند نمونے ہیں وہ دلچسپ ہیں اور عصری اسلوب کا پتہ دیتے ہیں۔

بین الاقوامی تجارتی تنظیم W.T.O. اور M.A.T. سے متعلق مضامین آج کے طالب علموں کے لیے بڑی افادیت کے حامل ہیں۔

قومی کونسل کی مطبوعات سے ماخوذ اقتباسات اور مضامین بہت اہم اور بامعنی ہوتے ہیں۔ اس بار بھی خواجہ غلام السیدین اور گیان چند جین کی کتابوں سے اخذ کی گئی تحریریں مفید اور قابل توجہ ہیں۔ "محقق کے اوصاف" سے متعلق گیان چند جین کی باتیں مبنی بر خلوص وحقائق ہیں۔ واقعہ ہے کہ اردو لسانی تحقیق اور ادب سے متعلق مستند افکار کو یکجا کرنے میں جین صاحب نے بڑا کام کیا ہے۔ مگر ان کی خدمات کا اعتراف اور اکرام اس درجہ نہیں کیا گیا جس کے وہ مستحق تھے جس کے ردعمل میں کچھ غلطیاں ان سے منسوب ہوگئیں یا کسی سازش کے تحت کر دی گئیں جن سے ان کی شخصیت مجروح یا آج کی زبان میں چھپی دھول ہوگئی۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان کی عمدہ اور روشن تحریروں کو بار بار شائع کیا جائے تاکہ نئی نسل کو اپنی کھوج میں مناسب روشنی مل سکے۔

■ **شاہد حبیب، جامعۃ الفلاح، بلیریا گنج، اعظم گڑھ (یو.پی)**

گذشتہ پانچ سال سے میں اردو دنیا کو پڑھتا آیا ہوں۔ واقعی آپ نے اس رسالے کو بام عروج تک پہنچادیا ہے۔ سائنس، ٹیکنالوجی اور جدید شعبہ ہائے حیات سے آپ اردو والوں کو واقف کرا رہے ہیں، زبان و ادب کو ان سے روشناس کرا رہے ہیں، یہی "اردو دنیا" کی انفرادیت ہے جس کی وجہ سے میں اس کا مطالعہ کرتا ہوں اور جب اسے پڑھ کر فارغ ہوتا ہوں تو اپنے اندر بیش بہا معلومات کے اضافے کو محسوس کرتا ہوں۔ "اردو دنیا" کی خبروں کو جس خوبصورتی اقسام اور تفصیل سے آپ شائع کرتے ہیں اس سے اردو کی موجودہ صورتحال اور ترقی کا اندازہ ہوتا ہے، اس کے لیے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

گذشتہ 17 جنوری کو ہم سے روٹھ کر ایک معتبر شاعر، اور ایک دردمند انسان ہمیں داغ مفارقت دے گیا۔ جسے ہم اور آپ فضا ابن فیضی کے نام سے جانتے تھے۔ آپ ایک قادر الکلام شاعر اور زبان اردو پر مکمل عبور رکھنے والے باکمال انسان تھے۔ آپ کی آواز جدید اردو شاعری میں ایک منفرد و مخصوص اور جانی پہچانی آواز تھی۔ آپ کا تخلیقی سفر بھی کافی طویل رہا۔ آدھا درجن سے زائد مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ بقیہ کی عدم اشاعت کا سبب مالی پریشانی ہی ہوسکتی ہے۔ ان کی اشاعت ہماری ذمے داری ہے، اسے محسوس کریں۔ ایسے بے نظیر شاعر کی قدردانی جیسی ہونی چاہیے تھی نہ ہوسکی۔ نہ ہی ہمارے ناقدین نے ان کی طرف توجہ کی اور نہ ہی کسی معتبر ادبی رسالے نے ان پر گوشہ یا نمبر شائع کیا۔ آپ کی عزلت پسندی اور دنیاوی چمک دمک سے ہمیشہ دوری کے نتیجے ہی میں ہمارے نقادان ادب اور علمبرداران سخن نے آپ کو کبھی لائق اعتنا نہیں سمجھا اور ادب میں آپ کو وہ مرتبہ و مقام نہیں دیا جس کے آپ مستحق تھے۔ نہ ہی حکومتی سطح کے کسی ایوارڈ کے لیے آپ کے نام کی سفارش کی گئی۔

آپ نے فروری کے شمارے کے اداریے میں ان کی وفات کا تذکرہ کیا ہے اور ان کی خدمات کا اعتراف بھی۔ لیکن کیا ہی اچھا ہو آپ فضا جیسے قادر الکلام شاعر کی حیات و خدمات اور کارناموں پر مشتمل "اردو دنیا" کا ایک شمارہ خاص کردیں۔ امید ہے آپ میری اس گزارش پر سنجیدگی سے غور فرمائیں گے۔

ہم فضا صاحب کے فکر و فن پر جلد ہی مضمون شائع کریں گے۔ ادارہ

■ **امتیاز سرمد 125، نرمدا ہاسٹل، جے.این.یو نئی دہلی**

"اردو دنیا" کا تازہ شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ اداریے میں مولانا آزاد کے حوالے سے سنجیدہ گفتگو بے حد پسند آئی۔ ماہر لسانیات مرزا خلیل احمد بیگ سے وحید الحق کا کیا ہوا انٹرویو وقیع ہے۔ موصوف نے سوالوں کے جواب بہت ہی علمی انداز میں دیے ہیں۔ زبان، اس کا وجود میں آنا، اس کی قسمیں، اردو میں لسانیاتی مطالعہ وغیرہ موضوعات پر سیر حاصل گفتگو ہوئی ہے۔ اگر اردو زبان کے عصری مسائل اور موصوف کے ذاتی تجربات کے حوالے سے بھی گفتگو ہوتی تو مجھ جیسے طلبہ پر احسان ہوتا۔ دیگر مشمولات بھی اچھے ہیں۔ امام اعظم نے "اردو زبان۔ مسائل اور حل" میں اہم مسائل کی نشاندہی کی ہے۔ عاصم شہنواز شبلی نے "آب وسراب" پر اچھی گفتگو کی ہے لیکن فنی اعتبار سے تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔

■ **ڈاکٹر حلیمہ فردوس، صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ آر. سی. کامرس کالج، بنگلور**

مہینے کے آخری ہفتے ہی سے "اردو دنیا" کا انتظار رہتا ہے۔ کبھی کبھی ڈاک کی مہربانی سے یہ رسالہ ہاتھ نہیں لگتا تو بڑا قلق ہوتا ہے۔ اس کے صوری و معنوی حسن کے بارے میں بس اتنا کہنا چاہوں گی کہ ہر شمارہ خوبصورت تصاویر سے مزین اور مشمولات کے اعتبار سے دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

■ **عبدالرحیم نشتر، سوداگر اپارٹمنٹ، گڑگاؤں، رائے گڑھ (ہریانہ)**

"اردو دنیا" کا مارچ کا شمارہ موصول ہوا، شکریہ

اس بار بھی خاصی معتبر اور موقر تحریروں سے آراستہ "اردو دنیا" بڑا پرکشش اور قابل قدر ہے۔ زبان و تعلیم، ادب، سائنس اور معاشیات اور کیریئر کے زیر عنوان نہایت اہم اور قابل مطالعہ تخلیقات و مضامین کی شمولیت سے رسالہ نہایت معیاری اور محبوب ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر ابوبکر عباد اور مخمور سعیدی صاحبان کو مبارکباد۔

بچوں کے گوشے میں آپ نے میرا مضمون شریک اشاعت کیا۔ اس کے لیے بے حد شکر گزار ہوں۔

□□□

ہماری بات

رالف رسل کے نام اور اردو زبان و ادب سے ان کے غیر معمولی ذہنی شغف سے تمام اردو والے واقف ہیں۔ آزادی کے بعد اردو ہندوستان میں جن ناسازگار حالات سے دوچار ہوئی، بالخصوص اس کی تعلیم کی راہ میں جو رکاوٹیں پیدا کی گئیں ان سے بھی رسل باخبر تھے۔ حالات اب اتنے ناموافق نہیں ہیں اور جن ریاستوں میں اردو کو بعض مقاصد کے لیے دوسری سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کرلیا گیا ہے وہاں کے کچھ علاقوں میں اردو پڑھنے کے خواہشمند طلبہ کے لیے اردو پڑھانے والے اساتذہ کا تقرر بھی کیا جانے لگا ہے، لیکن ہر جگہ یہ سہولت اب بھی موجود نہیں ہے۔ ہم اس مسئلے پر ''اردو دنیا'' میں اکثر لکھتے رہے ہیں اور زور دیتے رہے ہیں کہ جہاں جہاں یہ سہولت موجود نہ ہو، ہمیں اپنے طور پر اپنی نئی نسلوں کو اردو پڑھانے کا انتظام کرنا چاہیے — ذیل میں ہم رالف رسل کے ایک طویل مضمون کا اقتباس پیش کررہے ہیں جس میں انھوں نے یہی بات زور دے کر کہی ہے۔ رالف رسل کے اس مضمون کا اردو ترجمہ جو محترمہ ارجمند آرا نے کیا ہے، قومی اردو کونسل کے سہ ماہی جریدے ''فکر وتحقیق'' کے تازہ شمارے میں شائع ہوا ہے۔ یہ مضمون اردو کو درپیش بہت سے مسائل کا احاطہ کرتا ہے۔ ''اردو دنیا'' کے قارئین کے لیے ہم اس کے اہم اقتباسات آئندہ بھی شائع کرتے رہیں گے۔ درج ذیل اقتباس کی اہمیت کے پیش نظر اسے اداریے کی جگہ شائع کیا جارہا ہے۔ تو ملاحظہ کیجیے اردو کے تئیں ایک غیر ملکی دلدادۂ اردو کی دردمندانہ اپیل:

● اردو کی ترویج کے لیے جو موثر اقدام اردو داں حضرات کی طرف سے کیے جاسکتے ہیں ان میں پہلا طریقہ جس پر وہ عمل پیرا ہوسکتے ہیں، یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اردو پڑھنا اور لکھنا سکھانے کی ضمانت لیں۔ اگر اسکولوں کی طرف سے اردو کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے تو یہ والدین کی ذمے داری ہے کہ وہ یہ انتظام کریں، لیکن مشاہدہ یہ ہے کہ بیشتر اردو والے ایسا نہیں کرتے۔ میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ اردو بولنے والے ان لوگوں تک نے بھی جن کی اپنی زندگیاں عموماً اردو کے لیے وقف تھیں اور ان کے بچے اردو میں دل چسپی بھی لیتے تھے، اپنے بچوں کو اردو پڑھنا اور لکھنا نہیں سکھایا۔ ان لوگوں کے لیے اردو صرف گھر کے اندر بولی جانے والی زبان تھی یا ہے...... یادش بخیر، ایک مرتبہ میں اپنے ایک دوست (مرحوم) حبیب الرحمٰن سے ملاقات کی غرض سے گیا۔ وہ ماسکو میں رہتے تھے جہاں ان کی ایک نوجوان خاتون رشتے دار آئی ہوئی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنی پسند کے اشعار دیوناگری لپی میں درج کررہی تھیں۔ ایک اور موقعے پر میں عصمت چغتائی سے ملا۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ ان کی بیٹی کو اردو نہیں آتی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ والدین یہ انتظام کیوں نہیں کرتے کہ ان کے بچے اردو پڑھنا لکھنا سیکھیں۔ میری اپنی رائے یہ ہے کہ چاہے کتنی بھی مشکلات کیوں نہ درپیش ہوں، یہ محبانِ اردو کی اولین ذمے داری ہے کہ وہ اپنے بچوں کے لیے اردو کی تعلیم کے حصول کا انتظام خود ہی کریں۔ وہ ایسا کرسکتے تھے اور ان کو ایسا کرنا چاہیے تھا لیکن اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو انھوں نے ایسا نہیں کیا ہے۔

اردو والوں کو یہ بات واضح طور پر معلوم ہونی چاہیے کہ اردو کے تحفظ کے لائحۂ عمل کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ اردو میں مہارت رکھنے والے لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہو۔ اردو میں مہارت رکھنے سے میری مراد یہ نہیں کہ وہ اچھی اردو بولنے پر قدرت رکھتے ہوں بلکہ ضروری یہ ہے کہ وہ اس اردو سے واقف ہوں جو تحریری شکل میں موجود ہے اور جس کے مطالعے سے اردو ادب کا ذوق بیدار ہوسکتا ہے۔ میری مراد واضح طور پر یہ ہے کہ اردو جاننے کا مطلب اردو رسم خط سے واقفیت ہے۔..... میں سب سے پہلے اس نکتے پر زور دینا چاہتا ہوں کہ اگر کسی شخص کو اردو میں مہارت رکھنے والے لوگوں کی تعداد کے اضافے میں دل چسپی ہے تو وہ بغیر کسی بیرونی مدد کے انفرادی طور پر اس مقصد کے حصول کے لیے عملاً کچھ نہ کچھ ضرور کرسکتا ہے۔ اس کے لیے اسے جس جذبے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ ہے اس کام کو کرنے کا جذبہ، رضاکارانہ طور پر کچھ وقت صرف کرنے کا جذبہ اور اپنے طور پر کچھ وسائل مہیا کرنے کا جذبہ۔ اس سیاق و سباق میں برطانیہ جیسے ممالک میں آکر آباد ہونے والی بہت سی لسانی و تہذیبی اقوام کے طرزِ عمل سے سبق حاصل کیا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر برطانیہ میں سکونت اختیار کرنے والے گجراتی، پنجابی، ایرانی، پولش زبان بولنے والے اور دوسرے لوگ بھی تقریباً ایسے ہی حالات سے دوچار ہیں جن سے ہندوستان میں اردو داں حضرات کے بچے گزر رہے ہیں۔ برطانیہ میں جو لوگ اپنے بچوں کو اپنی موروثی زبان کی اس سے بہتر تعلیم دینا چاہتے ہیں جو برطانیہ میں اسکولوں اور تعلیمی نظام میں رائج ہے، اس کے لیے وہ رضاکارانہ طور پر کام کرتے ہیں یعنی وہ خود ہی جز وقتی کلاسوں کا انتظام کرتے ہیں، کمرے کرائے پر لیتے ہیں یا گھروں میں ہی نسبتاً بڑے کمروں میں انتظام کرکے اپنے بچوں کو اپنی موروثی زبان کی تعلیم دیتے ہیں۔ میرے خیال میں اس کی بہ ظاہر کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہندوستان میں اردو داں حضرات بھی اپنے بچوں کو رضاکارانہ طور پر تعلیم دینے کے لیے جز وقتی طریق تعلیم پر عمل پیرا نہ ہوں۔

□□□

اشرف رفیع

اردو — انگریزی لغت مجتہدی

بیسویں صدی نہ صرف ہندوستان بلکہ مشرق و مغرب کے کئی ممالک کے لیے انقلاب آفریں صدی رہی ہے۔ ہندوستان کی سرزمین اس انقلاب کی آہٹ 1857 بلکہ 1800 ہی سے محسوس کررہی تھی۔ انگریز آئے تو ہندوستان کے لیے اپنے ساتھ غلامی کی صعوبتیں بھی لائے مگر ساتھ ہی علم و ہنر اور فکر و نظر کی وہ رحمتیں بھی لائے جن کی وجہ سے ہندوستانیوں کو جہانِ تازہ کھلی آنکھ سے دیکھنے، اپنے حال سے نمٹنے اور مستقبل میں دور تک کمندیں ڈالنے کا حوصلہ ملا۔ علم، حکمت، حکومت کی فتوحات، مدنیت کے برکات، برق و بخارات کے کمالات، بندۂ مزدور کے بدلتے ہوئے حالات، سرمایہ داروں اور سرمایہ پرستوں کے مکر و منکرات، علم و فن اور دین و دانش کی گرہ کشائیوں نے گردشِ آفتاب کے جلوۂ بے حجاب سے دم بدم لفظوں کو لسانِ عصر بننے کا پیغام دیا۔

انیسویں صدی میں مستشرقین کی لکھی لغتیں بنیاد کا پتھر ثابت ہوئیں۔ اس کے بعد ہندوستانیوں نے پہلے تو یک لسانی لغت تیار کیں۔ جیسے جیسے اردو کا دائرہ کار بڑھتا گیا ذولسانی اور سہ لسانی لغات کی ضرورت شدت سے محسوس کی جانے لگی۔ 1901 میں ''فرہنگ آصفیہ'' (سید احمد دہلوی) 31-1924 میں ''نوراللغات'' (نورالحسن نیر کاکوروی) 1958 میں ''مہذب اللغات'' (مہذب لکھنوی) کی یک لسانی لغت، اردو لغت نویسی کا بیش قیمت سرمایہ ثابت ہوئیں۔ لیکن بابائے اردو مولوی عبدالحق کی ''ذولسانی لغت'' ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے اس لغت کو لغت نویسی کے سائنٹفک اصولوں پر استوار کرنے کی انتھک کوشش کی۔ ذولسانی لغت کا یہ سلسلہ اوپر فرگوسن، جان گلکرسٹ، جان شیکسپیئر، جے ٹی ٹامسن، رابرٹ شیڈون ڈاولی سے ہوتا ہوا ڈنکن فاربس کی ''ہندوستانی انگریزی'' اور ''انگریزی ہندوستانی ڈکشنری'' تک پہنچتا ہے جو 1848 میں لندن سے شائع ہوئی۔ فاربس کے بعد فیلن کی ''نیو انگلش — ہندوستانی ڈکشنری'' (1883) اور پلیٹس کی سہ لسانی اردو کلاسیکل ہندی اور انگلش ضخیم ڈکشنری (1884) نے بعد میں آنے والے لغت نگاروں کے لیے لغت نگاری کے سانچے مضبوط کیے۔

مولوی عبدالحق نے بیسویں صدی کے نصف اول میں انگریزی — اردو لغت کی ضرورت کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ ایک ''انگلش — اردو ڈکشنری'' (1937) اورنگ آباد سے شائع بھی کی۔ اس وقت ان کے پیش نظر دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ میں مختلف علوم کے تراجم کے دوران پیش آنے والے مسائل اور مراحل تھے۔ اسی لغت نے ایک عرصے تک مترجمین، اساتذہ اور طالب علموں کی علمی اور فنی مطالعہ و تراجم کے دوران لفظوں اور اصطلاحوں کی گرہ کشائی کی۔

اس کے بعد رام نرائن لال کی ''اردو — انگریزی اسٹوڈنٹس ڈکشنری'' اور فیروز اینڈ سنس لاہور کی ''اردو — انگریزی لغت'' 1966 میں منظرِ عام پر آئی۔ بشیر احمد قریشی کی ''اردو — انگریزی لغت'' 1982 میں شائع ہوئی۔ یہ لغات بھی ہمہ جہت علمی تراجم کے لیے ناکافی ثابت ہوئیں۔ بابائے اردو کی لغت ہی مشکل کشائی کرتی رہی۔ کبھی کبھی تو مترجمین کو اس لغت سے بھی روشنی نہ مل پائی۔

یعقوب میراں مجتہدی نے حکومت آندھرا پردیش حیدرآباد میں بحیثیت مددگار مترجم (اردو) تقریباً تیس برس خدمات انجام دیں۔ وہ 1989 میں ڈپٹی ڈائرکٹر کے عہدے سے وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ اپنی ملازمت کے دوران آئے دن انھیں ہر قسم کے قانونی، سیاسی، صحافتی، دفتری سائنسی، فنی، علمی اور ادبی تراجم کرنے پڑے تھے۔ انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرتے وقت مولوی عبدالحق کی ''انگریزی — اردو ڈکشنری'' سے کسی حد تک کام نکل جاتا تھا مگر اردو سے انگریزی میں ترجمے کے دوران مناسب مترادفات کی تلاش مشکل مسئلہ بن جاتی تھی۔ فاربس، فیلن اور پلیٹس کی ڈکشنریاں اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود ترجمے کی گتھیاں سلجھانے سے قاصر رہیں۔ ان کے محکمے میں اکثر اوقات تراجم فی الفور کرنے پڑتے تھے۔ مجبوری نے مجتہدی صاحب کو بہت کچھ سکھا دیا۔ ان کے راستے کے سنگ گراں تو ہٹتے گئے مگر یہ خیال بھی ستاتا رہا کہ کوئی جامع اردو انگریزی لغت ضرور ہونی چاہیے جو مترجمین، معلمین اور محققین کی ضرورتوں کو زیادہ سے زیادہ پورا کر سکے۔ پھر خود ہی اس میدان کارزار میں اتر آئے۔ اپنی ملازمت کے دوران ہی انھوں نے اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا۔ ملازمت سے سبکدوشی سے بہت پہلے ہی وہ اردو الفاظ اور مرادف انگریزی معنی کے تقریباً تین لاکھ کارڈ بنا چکے تھے۔ وظیفے کے بعد لغت نگاری کا وظیفہ جاری رہا۔ پچیس سال محنت شاقہ کے بعد (2812) صفحات پر مشتمل یہ ضخیم ڈکشنری تیار ہوئی۔

اپنی لغت کی تیاری میں میراں صاحب نے ''نوراللغات'' کو بنیادی اہمیت دی۔ مولوی عبدالحق کی ڈکشنری سے کام لیا۔ ان دونوں کے علاوہ فارسی، عربی، انگریزی اور دیگر ذولسانی اور ہمہ لسانی لغات (Polyglots) سے مدد

لی۔ مذہبی ڈکشنریوں، مختلف علوم کی اصطلاحاتی فرہنگوں، ہزارہا کتابوں حوالہ جاتی مواد سے استعانت حاصل کی۔ ترجمہ نگاری کے ذاتی تجربات سے وہ اگر نہ گزرے ہوتے تو شاید یہ محنت کشی و دیدہ ریزی کا کام اس پائے کا نہ ہو پاتا۔

اس میں نو دہزار سے زیادہ اندراجات ہیں، چار سو کے قریب اسلامی اصطلاحات موجود ہیں۔ قانونی اصطلاحات کی کوئی حد نہیں۔ قواعد، ریاضی، جغرافیہ، تاریخ، تعلیم، فلکیات، طب، طبیعیات کیمیا، معاشیات، فلسفہ، حیوانیات، صنعت وحرفت، سیاست، تجارت، صحافت، فوج و فوجداری عدلیہ و مالگزاری کے بعض ایسے الفاظ اور اصطلاحات ہیں جو اس سے پہلے کسی لغت میں شامل نہیں تھیں۔ شخصیات، مقامات کے نام اور متفرق معاشی و معاشرتی ضرب الامثال، محاورے، کہاوتیں، نام وانعام واعزازات بھی پہلی بار اس لغت میں شامل نظر آتے ہیں۔

یہ ڈکشنری اپنی پیش رو ڈکشنریوں کے مقابلے میں کئی اعتبار سے منفرد ہے اور اپنے عصری تقاضوں کی تکمیل کرتی ہے۔ لغت نگاری بحر ذخار میں غواصی کا کام ہے۔ سید یعقوب میراں مجتہدی بحر ذخار میں بے سروساماں کود پڑے تھے مگر ان کے جوش و دلولے کو دیکھ کر بندگان تحسین وظن سامان غواصی فراہم کرنے میں آگے آتے گئے۔ پرنس مفخم جاہ صدر نشین ایچ۔ ای۔ ایچ دی نظامس ٹرسٹ اور اردو اکادمی آندھرا پردیش کے علاوہ انفرادی طور پر بھی دست کشائیاں مرتب لغت کا حوصلہ بڑھاتی گئیں۔ یہ لغت، مجتہدی صاحب کے محدود وسائل سے منظر عام پر نہ آسکتی اگر جناب سید عبدالقادر جیلانی چیئرمین، سید ہاشم میموریل فاؤنڈیشن چنچل گوڑہ حیدرآباد، طباعت و اشاعت کے لیے خطیر رقم سے دستگیری نہ کرتے۔

''لغت مجتہدی'' کے بنیادی الفاظ 26000 ہیں۔ کوئی 18000 سے زیادہ مثالی فقرے ہیں۔ استعارے، محاورے، اصطلاحات شماری کا کام تو کوئی محنت کش ریسرچ اسکالر ہی کرسکتا ہے جو یعقوب میراں مجتہدی کی اس کاوش کو اپنی تحقیق کا آئندہ کبھی موضوع بنائے گا۔

لغت نویسی کا مقصد کسی زبان کے ذخیرۂ الفاظ کو جامعیت اور صحت کے ساتھ لغت کے مسلمہ اصولوں کے مطابق تہذیب وترتیب دینا ہوتا ہے۔ معیاری زبان کے علاوہ علاقائی دائروں میں مستعمل الفاظ اور ان کے مختلف روپ، اردو میں دخیل دوسری زبانوں کے الفاظ (جن میں عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت، ہندی، تلگو، مراٹھی، کنڑی، انگریزی، فرنچ، لاطینی، پرتگالی اور دیگر زبانیں شامل ہیں) جو اردو کے ہوگئے ہیں، یعقوب میراں مجتہدی نے اپنی لغت میں شامل کیے ہیں۔ متعدد الفاظ ایسے بھی ہیں جو کسی خاص علاقے میں بولے نہیں جاتے لیکن تحریر میں موجود ہیں۔ یا ایسے الفاظ جو اب تک تحریر میں نہیں آسکے مگر زبان زد خاص و عام ہیں، ''لغت مجتہدی'' کے خزانے میں شامل ہیں۔

اس ڈکشنری میں انگریزی کے کم و بیش سولہ سو الفاظ آئے ہیں جو اردو میں دخیل ہوگئے ہیں۔ اردو فارسی اور عربی ضرب الامثال کے لیے مترادف انگریزی ضرب الامثال دیے گئے ہیں۔ جہاں ضروری محسوس ہوا ان کی تشریح کی گئی ہے۔ مثلاً آنتوں کا قل ھو اللہ پڑھنا To cry out for food/to feel very hungry ''القرض مقراض المحبت'' کی انگریزی میں ضرب المثل ہے۔ Lend your money and loose your friend اطفال ہم گوش دارند Little pitchers have long ears, children apt to overhearing. ٹرانسلیشن ڈپارٹمنٹ میں ملازمت کے دوران مجتہدی صاحب کو ترجمہ کرتے وقت اصطلاحات کے ترجموں میں بڑی پریشانی اٹھانی پڑتی تھی۔ چنانچہ اپنی لغت میں انھوں نے مذہبی علوم، طبعی علوم، انسانی علوم، قانونی، دستوری، پارلیمانی، تاریخی، تہذیبی، فوجی، صحافتی، علمی، ادبی، فنی وغیرہ اصطلاحات پر خاص زور دیا ہے۔ ان کی ایک طویل فہرست ہے۔ یہاں مثالاً چند اردو اصطلاحات دی جاتی ہیں جو عصری صحافت و ادب میں مستعمل ہیں: تاب کاری۔ خود کش دستہ۔ سپاری۔ نکسل وادی۔ انتفاضہ۔ مواصلاتی۔ خانگیانا۔ دَل بدل۔ بالی وڈ۔ پختونستان وغیرہ

الفاظ کی لسانی حیثیت وقدر کی نشاندہی دوسری لغات کے مقابلے میں زیادہ صحیح طریقے پر کی گئی ہے۔ ہر لفظ کے ماخذ، اجزائے کلمہ، تذکیر وتانیث، واحد جمع کی حیثیت بتلائی گئی ہے۔ بہت سے ایسے الفاظ جو انگریزی ہیں اور مذکر ومؤنث دونوں طرح استعمال ہوتے ہیں ان کی تشریح کی ہے۔

حرف جار Preposition کے استعمال میں غلطی کے امکانات کا اظہار کرتے ہوئے اسم وفعل وغیرہ کے ساتھ حرف جار کی وضاحت بھی کی ہے۔ لسانی اور اسلوبیاتی قدر کا تعین کرتے ہوئے متروک، عامیانہ/لغوی اور مرادی معنوں کا اظہار کیا ہے۔

آج بھی جبکہ دنیا اس قدر تیز رفتار ہوگئی ہے، ابلاغ وترسیل نے فاصلے مٹا دیے ہیں تب بھی مقامی طور پر تلفظ ومعنی میں اختلافات پائے جاتے ہیں جیسے حیدرآباد دکن میں ''جام'' امرود کے لیے مستعمل ہے، ''دستی'' Handker chief کے لیے بولا جاتا ہے جبکہ شمال میں ''دستی'' کو رومال کہتے ہیں۔ دکن میں ''رومال'' لنگی جیسا دو گز کا ایک کپڑا ہوتا ہے جسے مرد عموماً (پچھلے زمانے میں) کندھوں پر ڈالا کرتے تھے اور اب بطور لنگی باندھتے ہیں۔ مجتہدی صاحب نے ایسے الفاظ کے محل استعمال اور علاقائی فرق کی وضاحت کی ہے۔

بعض علاقائی اصطلاحات جن کا تعلق رسم و رواج سے ہے، شمال اور جنوب، ہندوپاک میں مختلف ہیں جیسے ''گھر بھراونی'' یہ اصطلاح کسی لغت میں

نہیں ملتی نہ یہ شمالی ہند اور پاکستان میں رائج ہے۔ حیدرآباد میں یہ اصطلاح بھی بولتے ہیں۔ انگریزی میں اس کا مترادف House Warming ہے۔ جس کے معنی کی تشریح تو ملتی ہے مگر کوئی مترادف اور مناسب حال اصطلاح نہیں ملتی۔ یہ اور ایسی کئی اصطلاحات پہلی دفعہ لغت مجتہدی میں ملتی ہیں۔

الفاظ اپنے سیاق وسباق اور زمان ومکاں کے لحاظ سے ''رنگ روپ'' معانی ومفہوم بلکہ تلفظ تک بدلتے رہتے ہیں۔ ''لغت مجتہدی'' میں معانی ومفہوم کی تبدیلی کی پوری تاریخ پر جہاں جہاں ضروری تھا، روشنی ڈالی گئی ہے۔ بدلتے ہوئے تلفظ کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ پہلے عصری تلفظ دیا گیا ہے پھر وضاحت کرتے ہوئے ماضی میں اس لفظ کا تلفظ کہاں اور کب کیا رہا ہے بتایا گیا ہے۔

یک لسانی لغت نگار سے زیادہ ذمے داریاں ذولسانی لغت نگار پر آپڑتی ہیں۔ یعقوب میراں مجتہدی نے ان ذمے داریوں کو بڑی خوش اسلوبی سے نبھایا ہے۔ تھیسارس کا جو طریقہ زندہ زبانوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اسے مجتہدی صاحب نے بڑی حد تک اپنی لغت میں برتا ہے۔ اس طرح یہ لغت زبان کے تدریجی ارتقا کے ساتھ ہم آہنگ بھی ہوگئی ہے۔ مثال کے طور پر ایک لفظ ''آنکھ'' کے قریب چار سو محاورے وغیرہ دیے ہیں۔ اور لفظ ''بجلی'' کے انھوں نے دس مترادفات اور 28 اندراجات دیے ہیں جن سے زبان کے تاریخی تغیرات کے علاوہ سماجی، سیاسی، علمی، تہذیبی اور ادبی تغیرات اور بدلتے ہوئے اقدار کا بھی اندازہ ہوسکتا ہے۔

لغت خواہ یک لسانی ہو کہ ذولسانی اس میں ذخیرۂ الفاظ اور اس کے ترتیب کے بعد لفظ کے ہجا یا املا کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اس لغت میں بھی دوسری لغات کی طرح پہلے مفردات کو لیا گیا ہے اور پھر مفردات کے تحت تمام ممکنہ ذیلی اندراجات کو درج لغت کیا گیا ہے۔ تمام اندراجات کے معنی صحت و سند کے ساتھ دینے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

دکنی کے ایسے الفاظ بھی ''لغت مجتہدی'' میں شامل ہیں جن کا آج بھی یہاں چلن ہے جیسے ہَو، تَلو، ہلّو، ڈُبّا، ڈھَمُکڑی، وغیرہ۔ حیدرآباد کی بعض اصطلاحیں سلطنت آصفیہ کی یادگار ہیں۔ مثلاً صدر اعظم Prime Minister صدرالمہام Minister امیر جامعہ Chancellor معین امیر جامعہ Vice Chancellor مسجل Registrar وغیرہ ان اصطلاحوں کے جاننے والی حیدرآباد میں اب چند ہستیاں رہ گئی ہیں۔ گو یہ اصطلاحیں مروج نہیں مگر مورخین دکن اور محققین کے لیے آج بھی ان کی اہمیت ہے۔ ان انتظامی اصطلاحوں کے منجملہ تہذیبی اور تعلیمی اصطلاحوں میں کئی ایک درباری نوعیت کی ہیں جن میں سے ایک ''فرشی سلام'' بھی ہے جس کے انگریزی معنی کہیں نہیں ملتے۔ یعقوب میراں مجتہدی نے انگریزی میں اس کی مرادف اصطلاح خود تراشی ہے۔ سلام کو Anglicise کرکے To Slam down to the ground لکھا ہے۔

اردو انگریزی لغت میں لفظ کی ادائیگی کا مسئلہ بڑا نازک مسئلہ ہوتا ہے۔ مجتہدی صاحب نے تمام لفظوں، فقروں اور جملوں وغیرہ کی اردو رسم الخط کے ساتھ ساتھ نقل حرفی (transliteration) رومن رسم الخط میں کی ہے تاکہ صحیح تلفظ کی ادائیگی میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ رہے۔ تلفظ کا اندراج بین الاقوامی (IPA) صوتی ابجد کے اصولوں پر کیا ہے۔ ڈکشنری کے آغاز میں ابجد یا علامات کی فہرست شامل کردی ہے۔ رموز واوقاف کا بھی خصوصی لحاظ رکھا ہے۔

لغت میں بطور مثال جس جگہ جملے دیے ہیں وہیں اشعار سے بھی مدد لی ہے جن سے لفظوں، محاوروں، تلمیحات وغیرہ کے محل استعمال کی صراحت ہوجاتی ہے۔ غالب ہی کے تقریباً (70) اشعار سے کام لیا ہے جن کا ترجمہ پروفیسر یوسف حسین خاں نے کیا ہے۔

لغت نویسی میں عموماً لغات سے لغات نقل کرنے پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ یہ نسبتاً سہل انگاری کا کام ہے۔ کوئی شک نہیں کہ اس میں بھی محنت ضروری ہوتی ہے مگر تحقیق کی مشقت شامل نہیں رہتی۔ لغت نگاری، تحقیقی، تجزیاتی، علمی، ادبی اور لسانیاتی مذاق رکھنے والے فیصلہ کن ذہن کا کام ہے۔ یہ کام وسیع مطالعے اور امعان نظر کا متقاضی ہے۔ مجتہدی صاحب نہ شاعر، نہ ادیب، نہ محقق، نہ نقاد، نہ عروض وبلاغت سے آشنا، نہ ماہر لسانیات مگر اس لغت میں وہ ایک جامع الحیثیات نظر آتے ہیں۔ یہ لغت اگرچہ انسائیکلوپیڈیا نہیں مگر بقول استاذی پروفیسر مسعود حسین خاں ''ہر چند کہ یہ ایک انسائیکلوپیڈیا نہیں لیکن اس میں شامل ایسی معلومات ہیں جن کی اردو ادب کے پڑھنے والوں کو قدم قدم پر ضرورت پڑتی ہے۔''

لغت کی کمپوزنگ اور اس کے بعد پروف ریڈنگ انتہائی صبر آزما مرحلہ ہے۔ یہ مرحلہ بھی سید یعقوب میراں مجتہدی نے تن تنہا سر کیا ہے۔ ایک نہیں کئی دفعہ ان قریب قریب تین ہزار صفحوں پر مندرج ایک ایک لفظ ایک ایک حرف ایک ایک علامت اور رموز و اوقاف کو بہ نظر غائر دیکھنا آنکھوں کا تیل نکالنا ہے۔ یہ کام اگر ادارہ انجام دیتا تو ظاہر ہے کئی شخصیتیں اس کام میں شامل ہوتیں۔ آپسی تال میل، مزاجوں معیاروں اور فرصتوں کے متوقع اختلافات کی وجہ سے ڈکشنری کی ترتیب، تالیف اور تکمیل کی معیار بندی بھی معرض خطر میں پڑ جاتی۔ میراں صاحب نے تن تنہا پچیس سال پہلے اپنا سفینہ جس بحر ذخار میں ڈالا تھا وہ سفینہ اب کنارے آپہنچا۔ میراں مجتہدی کا یہ عشق لازوال ہی تھا جس نے انھیں منزل تک پہنچادیا۔

□□□

پتہ:
16-3-807/1/A, Chanchalguda,
Hyderabad-500024

نسیم احمد نسیم

اردو زبان اور علاقائی بولیاں

(بھوجپوری، نیپالی، تھروئی)

چمپارن شمالی بہار کا ایک اہم اور معروف خطہ ہے۔ یہ علاقہ زمانہ قدیم سے اپنی تاریخی، تہذیبی، ادبی اور سیاسی سرگرمیوں کے لیے پورے ملک میں جانا جاتا ہے۔ نیپال کی گود میں بسا یہ علاقہ دوسرے بہت سے علاقوں سے مختلف اور منفرد ہے۔ لسانی اعتبار سے چمپارن کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ یہاں اردو اور ہندی کے علاوہ بھوجپوری، تھروئی اور نیپالی بھی عوام میں رائج ہے۔

بھوجپوری چمپارن کی قدیم زبان ہے جسے سماج کا اعلیٰ سے اعلیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ طبقہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں استعمال کرتا ہے۔ اس زبان کی اپنی مستحکم روایت ہے۔ اس کے پاس لفظی اور شعری سرمائے کا قیمتی ذخیرہ ہے۔ لیکن بھوجپوری اور دوسری بولیوں کو دہلی اور لکھنؤ والے غیر فصیح مانتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ابتدا میں ہی دہلی اور لکھنؤ کو زبان کی ٹکسال تصور کرلیا گیا۔ اس لیے لغت کی ترتیب کے دوران یہی ماڈل بنتے رہے۔ کبھی کبھی بمبئی اور بھوپال کا بھی ذکر کردیا گیا۔ لیکن صحیح معنوں میں مذکورہ دونوں مراکز کے علاوہ دکنی اور گجراتی کو ہی قابل اعتنا سمجھا گیا۔ بہار میں بھوجپوری کا پھیلاؤ ہوتے ہوتے اس میں نئے محاورے، نئے الفاظ، نئی اصطلاحات، نئی تراکیب اور بعض اوقات نئے تلفظ بھی آئے لیکن نہ تو ان کا جائزہ لیا گیا اور نہ ہی انھیں قدر اور اعتبار کی نظر سے دیکھا گیا۔ اس کے باوجود بھوجپوری اپنی بعض امتیازی خصوصیات کی بنا پر آج بھی ملک کے گوشے گوشے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس مقالے میں میں نے بھوجپوری کی طرح تھروئی اور نیپالی زبانوں کی خوبیوں کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

جہاں تک بھوجپوری کا تعلق ہے، اس کا ایک مضبوط اور منظم لسانی ڈھانچہ ہے۔ اس کی اپنی قواعد ہے۔ لفظوں کے استعمال کے لیے اصول وضوابط ہیں۔ اس میں ایسے مصادر ہیں جو اسم ذات یا اسم صفت کی خصوصیات سے بنائے گئے ہیں۔ ٹکسالی زبان میں اس کی چند ہی مثالیں ملتی ہیں جیسے برمانا، گرمانا وغیرہ۔ لیکن بھوجپوری میں ایسے مصادر بہت پہلے سے موجود ہیں جیسے بتیانا، کھسیانا، موڑانا، چہ بیانا وغیرہ۔ اس کے علاوہ اسم سے فعل بنانے کا جو قاعدہ ہندی والوں نے وضع کیا ہے، بھوجپوری اسے بہت پہلے ہی اپنا چکی تھی۔ الفاظ کی جمع اس طرح بنائی جائے کہ مؤنث اور مذکر دونوں کے لیے موزوں ہو، یہ خاصہ بھوجپوری میں ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ جیسے لڑکن (لڑکی / لڑکے)، لوگن (مرد/عورت) وغیرہ۔ اس میں ''ر'' کا ''ڑ'' کے طور پر استعمال بھی رائج ہے جیسے مچھڑ، کچھڑ وغیرہ۔ بھوجپوری کی وسعت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ یہاں ایک ہی قبیل کے لفظ اپنے طریقۂ استعمال اور جائے استعمال سے اپنی شکل بدل لیتے ہیں۔ جیسے ہنسوا، ہنسلی، ہلیٹھا، پھنسل، پھنسلی وغیرہ۔ بھوجپوری کے محاورے نہایت فطری اور برمحل ہوتے ہیں جیسے: ادھی گدھی پوچھنا (تفصیل معلوم کرنا) ٹنڈیلی کرنا (خوشامد کرنا) ہاب ڈیب کرنا (ادھر ادھر کرنا) دانت چیارنا (جی حضوری کرنا) بھوٹ کٹوا (ووٹ خراب کرنے والا)

محاوروں کی طرح اس کی کہاوتیں بھی کم جاندار نہیں ہیں:

آیا تو آم گیا تو لبیدا، چلنی ہنسے سوپا کے جےمے بہتر چھید
تو کونا موکو چولھا میں جھونکو، کوڑھیا ڈروائے تھوک سے وغیرہ

اب کچھ مخصوص الفاظ ملاحظہ کریں جو عوام میں اپنی ترسیلی قوت کے باعث کافی مقبول ہیں۔ جیسے انکھیانا (نظر انداز کرنا)، لڑپٹر (غلط بیانی)، بیچ بیچ (مین میخ)، کھونچ کھانچ (نقص نکالنا)، انواٹ بوانٹ (بیکار) مجھر ہجر (الجھا ہوا) گیج گانج (خلط ملط)، بھکول (بدھو)۔ رشتوں میں بھوجائی، ساڑھو، جیٹھ، بھسر، نندوئی، پہونا، بھگنا، ناتی وغیرہ۔ گھریلو اشیا میں بدھنا، گھیلا، ٹھونگا، کھپڑا وغیرہ۔ افعال میں کھدیڑنا، کوڑنا، لُکنا، بھوجپوری کی گنتی بھی مختلف ہے جیسے اگاری، بارے، تیرے، چودے، سنتانیے، انٹھاون، نبے وغیرہ۔

جن اردو ادبا کا تعلق بہار اور بالخصوص چمپارن سے ہے وہ ارادی یا غیر ارادی طور بھوجپوری محاورات ولفظیات کو اپنی تحریروں میں بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کے بدل ٹکسالی زبان میں موجود ہیں۔ لیکن یہ ایک فطری عمل ہوتا ہے۔ جو زبان ملکی سطح پر بولی جاتی ہو اس میں مختلف علاقوں کے رنگ و آہنگ لازماً شامل ہوجاتے ہیں۔ حالانکہ مقامی بولیوں کے بہ کثرت استعمال سے ترسیلی مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں اور قاری مکالے کے مفہوم اور فن پارے کی روح تک پہنچنے سے رہ جاتا ہے۔ اس نارسائی کی وجہ سے مجموعی تاثر قائم ہونے میں دشواری ہوتی ہے۔ فن پاروں میں مقامی اثرات کو برتنے والے فن کاروں کے لیے ضروری ہے کہ متعلقہ خطوں کی روایت اور خوبو سے جڑے ہوں، لفظوں کے بنتے بگڑتے روپ پر نظر رکھتے ہوں تبھی جاکر ان کے ذریعے استعمال شدہ نامانوس اور اجنبی الفاظ اپنے معنی اور کیفیات کو واضح کرنے

میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اب ملاحظہ کریں چند کہانیوں اور کچھ گیتوں کے حصے جن میں بھوجپوری الفاظ اس طرح استعمال ہوئے ہیں کہ ان کا حسن دوبالا ہوگیا ہے۔ اور ترسیل کا مسئلہ سامنے نہیں آتا۔

''کارے دُلہنیا! ذرو چھ کا ہے بَند کرت باڑس۔ آج تو ہرا ئنکا کے ہم تیل لگائم''۔۔(کہانی ڈائن۔۔ذاکر کمار)

''للُوا! اُوللُوا! سالا کہاں مرگیا چوٹی والا'' (رنگا سیار۔۔ عظیم اقبال)

جیٹ دکھاتا ہے۔ سوکھا بانس ہے، مگر پھٹانی کرتا ہے (مسز جون۔۔ شر اختر)

غزلوں کے دو اشعار:

روز روز مُو مُو کے جیت
جَن گن مَن کے پیر لکھائی
بُون بُون لو ہو ٹپکاوت
محنت کے تاثیر لکھائی

گیتوں کے بول:

بھوجپوری تا یہ چوری کی بالی/ نا گھونگھٹ ڈالی کے منہ چوراوے
بھوجپوری ہوے دیس کے ریڑھ/ کی سیما پر جا کے چھاک چھوڑاوے
رنگ لیلی اوڈھوا/ جو بنوا پر ڈھر لیلی/ نیہیا کے سر یا بٹور
ڈولی چکھوا کے اور/ گنواں کے جاری اور

نیپالی: نیپال صرف پانچ سو میل طویل اور اسّی میل عریض علاقے میں پھیلا قدرتی حسن سے مزین خطۂ ارض ہے۔ یہاں 35 سے زیادہ چھوٹی بڑی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ جن میں گرونگ، بکلتی، نیواری، تمنگ، برمی، اودھی، ہندی، اردو اور بھوجپوری خاص ہیں۔ ہندوستان اور نیپال کے مابین صدیوں پرانا تہذیبی اور لسانی رشتہ رہا ہے۔ اس باہمی اختلاط نے نیپالی زبان و ادب کو اردو کے لفظی اور شعری سرمائے سے مالامال کیا ہے۔ نیپالی میں اردو اور بھوجپوری کے بے شمار الفاظ شامل ہیں اور یہ روزمرہ کی زندگی میں مستعمل بھی ہیں۔ موتی رام بھٹ، بھانو بھکت آچاریہ، دیوند راج اپادھیائے، رموور دیوی شاہ، کھڑک مان سنگھ جیسے ادبا و شعرا نے نیپال میں اردو زبان کو فروغ دینے میں اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ بیگم حضرت محل اور ان کے وفاداروں کی نیپال ہجرت کے بعد برجیس قدر کی خصوصی دلچسپی سے یہ شعرا اردو کی طرف راغب ہوئے۔ انھوں نے نہ صرف زبان سیکھی، بلکہ اپنی تخلیقات میں اردو الفاظ کا کثرت سے استعمال بھی کیا۔ نیپال اور بہار نے بھی ایک دوسرے کی زبانوں سے استفادہ کیا۔ نیپالی، چمپارن کے سرحدی علاقوں میں بھی رائج ہے۔ واضح ہو کہ پہاڑی نیپالی الگ ہے اور ترائی کی نیپالی الگ۔ ترائی کی نیپالی، چمپارن میں رائج ہے اور چمپارن کی بھوجپوری ترائی کے نیپال میں مروج ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ بہار اور نیپال کے سرحدی علاقوں میں لسانی لین دین کا عمل صدیوں سے جاری ہے۔ یہی سبب ہے کہ آل انڈیا ریڈیو نیپالی میں خبریں نشر کرتا ہے۔ یہ خبریں نیپالیوں کے لیے نہیں، سرحد پر ہندوستانیوں یعنی بہاریوں کے لیے ہوتی ہیں۔ نیپال سے ملحق چمپارن کے مشرقی اور مغربی حصے نیپالی الفاظ، تلفظ اور ان کے مخصوص لب و لہجے سے بہت ہی متاثر ہوئے ہیں۔

نیپالی ادیب اور شاعر اردو اور بھوجپوری سے مرعوب ہیں، وہ اپنے فن پاروں میں ان زبانوں کے الفاظ صرف استعمال ہی نہیں کرتے بلکہ ادبی حلقوں میں ان پر تبادلۂ خیال بھی کرتے ہیں۔ وہ غزل کے فن پر مذاکرے کرتے ہیں۔ ایک نیپالی کا ناقد فن غزل کو اپنے طور پر سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ غزل بہت پرانی اور ہر دلعزیز صنف سخن ہے۔ اس کے کچھ اصول اور ضابطے ہیں: اس کی زبان میں ملاحظہ کریں:

''غزل گئے وِدیا ہو۔ پرانا غزل کار ہَرو اردو بھاشا کا نیتی نیَم انو کولیت تھے منے۔''

ایک دوسرے ناقد وِجے سبا کے مطابق غزل کے فن سے مکمل واقفیت لازمی ہے۔ ردیف، وزن اور موسیقیت کے بغیر غزل کی کشش اور شیرینی ماند پڑ جاتی ہے۔ اسے نیپالی میں دیکھیں:

''غزل رَچنا کا آپنے نیَم ہَرو۔ ردیف، وزن، موسیقیت، انداز بیان کو کوشل سایوجن واٹ غزل اُت کرشٹ بنے سکنے چھ۔ ردیف قافیہ کو چلن جنتہ کی کمزوری ہے غزل ہُو پرے مٹھاس کین چھ''

ان اقتباسات سے غزل کے تئیں ان کی دلچسپی، لگاؤ اور سنجیدگی کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ آج ہر نیپالی شاعر غزلیں کہنا فخر کی بات سمجھتا ہے۔ شعرا غزل کے اس قدر گرویدہ ہو چکے ہیں کہ انھوں نے اپنی غزلوں کے کئی مجموعے شائع کیے ہیں۔ کئی ادبی اور معیاری رسالوں نے اپنے غزل نمبر شائع کیے ہیں۔ جن میں کو پیلا (کاٹھمنڈو)، کاچولی (پالپا) اپہار (جھاپا) پرواہ (بھکت پور) پروتسا ہن (اودے پور) خاص ہیں۔

اب نیپالی کی شعری اور نثری تخلیقات پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ ان میں اردو اور بھوجپوری کی جھلک صاف طور پر محسوس ہوگی۔

نیپالی غزل کے اشعار:

موسم یو اُداس بنے چھ، سارا جگ اداس
آوندو ہنا ہینڈ جب ابھی بھارہ بنا
نرواست بھئے کو گھیرے یاں مو آواز ہَرو
مون جلوس سڑک ما چھ کنے نعرہ بنا
(ٹیکارام اداسی)

آس ڈوبتوس ڈوبس کیوں آندھی بیری بیش
ترکھلن پتھر پھوڑے آخر لی چھے بچ ہی بیش

نظموں کے کچھ حصے:

تُمی بنا زندگی یوں برباد نے بھیو
آنسو کوئے سمندر اے نیائے چھ بھیو
رتی انہیں آنکھا ہر ورتی رہیو
تمی بنا زندگی یوں برباد نے بھیو

ایک گیت کا حصہ:

ڈھاک کے ٹوپی سیر ما   جھلک کے جھلکی کیبو
چھاتر بھتر مایا کو آگ جل تیو   ہے بجلی کو تار تار
فرمت کچھے نا اے حضور   آوندے شنی وار

اخیر میں ویشو پشور پرساد کوئرالا کی کہانی ''ایک رات'' سے چند جملے ملاحظہ کریں:

''کاجل کوآ کاش ما ایک سنگ سلمہ ستارہ جھلکے کا ہرون کو چھسی نا
تھانہ ما پرائیویٹ نیائے کوٹھی مادر بار ما خوب چہل پہل بھیئے
باقی رہے کو کاغذ ما افسر ہرو کو دستخط پروے ہو۔ پھیری تینوں جلوس
شانت بھیر ہنڈی ریو اچانک شور ے بھیو۔ جیل کو باہر دایاں بایاں
دو کالا ما کھاڑا تھیو۔''

تھروئی: مورخین کا ماننا ہے کہ تھاروں کا پرانا مسکن راجستھان ہے۔ تھارو راجپوتوں کی نسل ہیں۔ یہ لوگ نامساعد حالات میں اپنے علاقوں سے نکلے اور مختلف پہاڑی علاقوں بالخصوص بہار، یوپی، آسام، ہماچل اور نیپال کے سرحدی علاقوں میں بس گئے۔ ان کا رہن سہن سادہ ہے۔ حالات نے انھیں آدی باسی بن کر رہنے پر مجبور کیا۔ ان کا پہناوا آج بھی انوکھا ہے۔ یہ لنگوٹ پہنتے ہیں۔ جاڑا آنے پر بڑا سا کوٹ پہن لیتے ہیں۔ سر پر اونی کپڑے کی کالی ٹوپی اور کندھے پر کمبل ان کے ساتھ ہمیشہ ہوتا ہے۔ عورتیں کرتے اور کالے رنگ کے گھاگھرے کا استعمال کرتی ہیں، یہ بہترین شکاری ہوتے ہیں۔ ان کا نشانہ اچوک ہوتا ہے۔ ان کی عورتیں آج بھی خود کو راجپوت رانیاں سمجھتی ہیں اور مردوں کو اپنا داس۔ اس کے باوجود وہ اپنے شوہروں کا خیال رکھتی ہیں۔ یہ لوگ برہمنوں سے نفرت کرتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ برہمنوں نے ان کے ساتھ بہت برے برتاؤ کیے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ اپنے تمام رسم و رواج برہمنوں کے بغیر ہی پورے کرتے ہیں۔

تھاروں کی زبان تھروئی انھی کی طرح رنگا رنگ اور انوکھی ہے۔ ان کی بولی یوپی میں نینی تال، گورکھپور، بستی، لکھیم پور، نیپال میں کیلالی، باندیا، ڈانگ میں اودھی سے متاثر ہے۔ مغربی چمپارن اور نیپال کے کپل وستو، چتون، پارسا، بارہ، روتھہٹ ضلعوں میں تھارو زبان پر بھوجپوری کی زبردست پکڑ ہے۔ زمانہ قدیم میں تھروئی کا بہت رواج تھا۔ ان کے یہاں تعلیم کا چلن نہیں رہا اس لیے ان کا ادب تحریری شکل میں موجود نہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ صورت حال تبدیل ہو رہی ہے۔ چمپارن میں ''بہار شکچھا پریوجنا'' کے ذریعے ان کی لڑکیاں تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ لڑکے بھی اپنے علاقوں سے نکل کر تعلیمی میدان میں پہنچ رہے ہیں۔ آج کل تھروئی ادب پر بھی کچھ کام ہو رہا ہے اور ہندی انگریزی میں کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا تھروئی زبان چمپارن میں بھوجپوری سے متاثر ہے، اس کے باوجود ان کی اپنی چھاپ صاف جھلکتی ہے۔ وہ مختلف زمانوں کو اپنی روایتی لفظیات کے ذریعے آج بھی ظاہر کرتے ہیں جیسے:

مئی جئی ہوں (میں جاتا ہوں)۔ منئی جائت (آدمی جاتا ہے)
رام جاکا (رام جاتا ہے) سیتا ہیرت رہے (سیتا دیکھ رہی تھی)
کاتئی پڑھئی (کیا تم پڑھو گے) ان کے یہاں فعل ماضی میں واحد ''لے'' اور ''رہے'' ہے۔ زمانہ حال کے لیے ''تہوتو'' اور ''ایہا'' اور مستقبل کے لیے ''وے'' کا استعمال ہوتا ہے۔

ان کے یہاں مختلف موسموں، تقریبات اور مواقع پر الگ الگ گیت گائے جاتے ہیں۔ کچھ گیت تنہا اور کچھ گروپ میں گائے جاتے ہیں۔ آلات موسیقی کا استعمال کہیں ہوتا ہے، کہیں نہیں۔ گیت کے خاص موضوعات یا تو مناظر فطرت کی عکاسی ہے یا عشق و عاشقی کا بے لاگ اظہار۔

چند گیتوں کے ٹکڑے ملاحظہ کریں۔ یہ گیت دوسرے تھارو یا آدی باسی علاقوں سے الگ ہیں۔ ان گیتوں میں چمپارن کے رہن سہن، بول چال کے عکس جھلملاتے نظر آئیں گے۔

وہی وہی ناک کے جھولنیاں ردھیا/ ہم لیوے گیلی ہے/ سیتیاں مورا
کنہوئی ہے نرکٹیاں بزریا/ لاوے ہے لاگی ہے سیندریا
کون جیبے حاجی پور/ کون جیمنیں پٹنہ/ کون جیمیں بتیا نوکریا
بابا جیمیں حاجی پور، بھیا جیمیں پٹنہ/ سیہیاں جیبے بتیا نوکریا
جھر ہر جھر ہر ندیا بہے/ گوری تیریا بھادر مارے/ جھپٹل چیلہیا کئی گولیا
اوہی رے سَمر ڈار
آرے آرے بھیا بھینس چرواہوا/ تاؤں نا جاسی
لے تو ہار
سمر ڈار سے ہر یّادھی جھو نیوا/ تورا مورا بھوگ ولاس
(مطلب یہ کہ: ایک لڑکی مچھلی پکڑ رہی ہے۔ ایک چیل منڈلاتی ہوئی آتی

ہے اور اس کے گلے کا ہار جھپٹ کر سیمل کے درخت کی شاخ پر بیٹھ جاتی ہے۔ یہ دیکھ کر لڑکی فکر مند ہوتی ہے۔ وہ ایک بھینس چرانے والے سے کہتی ہے کہ تم میرا ہار درخت سے لادو تو ہم پیار محبت یعنی بھوگ ولاس کریں گے

ان گیتوں میں بھوجپوری کے الفاظ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ لیکن بیشتر مقامات پر افعال اور ان کے مخصوص الفاظ بھی نظر انداز نہیں ہوئے ہیں۔ ان گیتوں سے ان کی سادگی، ان کا بھولا پن اور ان کا طرز معاشرت بھی عیاں ہو جاتا ہے۔

اوپر کی سطور میں چمپارن کی تین مخصوص بولیوں کی بابت حتی المقدور اطلاعات فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ زبان جامد شے نہیں، یہ کسی سرحد میں مقید بھی نہیں رہ سکتی، یہ وقت اور حالات کے لحاظ سے سفر کرتی ہے، اپنے رنگ ڈھنگ تبدیل کرتی ہے، اپنے نقوش دوسری زبانوں پر چھوڑتی ہے اور دوسری زبانوں کے اثرات خود بھی قبول کر لیتی ہے۔

□□□

پتہ:
2, Ehsan Manzil,
Near Makhania Kuan Masjid,
Patna-800004

فورٹ ولیم کالج کے نسخۂ کلیات میر (مطبوعہ 1811) کے بعد کلام میر کا صحیح ترین اور مکمل ترین نسخہ

کلیات میر (دو جلدوں میں)

جلد اول (مکمل چھ دیوان غزلیات) صفحات: 870● قیمت 402 روپے مجلد، 336 روپے غیر مجلد ● سائز: 20X26X8

مرتب: ظل عباس عباسی ● بہ تصحیح و اضافہ: احمد محفوظ ● زیر نگرانی: شمس الرحمٰن فاروقی

جلد دوم (قصیدہ، مثنوی، مرثیہ وغیرہ) صفحات: 632● قیمت 430 روپے مجلد، 410 روپے غیر مجلد

تحقیق و ترتیب: احمد محفوظ ● زیر نگرانی: شمس الرحمٰن فاروقی

- اس نسخے کو تمام اہم اور قابل ذکر مطبوعہ نسخوں کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہے اور بقدر ضرورت قلمی نسخوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔
- کلام میر میں مستعمل بے شمار نادر اور نامانوس الفاظ کی صحت و درستی کو بڑی حد تک یقینی بنایا گیا ہے۔
- نسخۂ عباسی جو صرف غزلیات پر مشتمل تھا اس میں نسخۂ محمود آباد سے بہت سارا کلام لے کر اضافہ کیا گیا ہے۔ اس طرح اب جلد اول میں غزلیات کی کل تعداد 1916 ہے جو ابھی تک کے تمام مطبوعہ نسخوں سے زیادہ ہے۔ غزلیات میں اشعار کی کل تعداد 13908 ہے۔
- جلد دوم میں میر کے تمام مرثیوں کو پہلی بار پوری صحت کے ساتھ مکمل صورت میں سامنے لایا گیا ہے۔
- جلد دوم میں منظومات کو پہلی بار بالکل نئی، مناسب اور بااصول ترتیب سے رکھا گیا ہے۔ اس طرح نسخے میں شامل کسی بھی منظومے کو تلاش کر لینا آسان ہو گیا ہے۔
- دونوں جلدوں میں متن کی تصحیح کے دوران مختلف مستند اور بعض نادر لغات اور فرہنگوں کا سہارا لیا گیا ہے۔
- جلد دوم میں دو تفصیلی دیباچے شامل ہیں۔ احمد محفوظ کے دیباچے میں کلام میر کی تدوین و تصحیح متن سے متعلق نہایت اہم امور زیر بحث لائے گئے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے دیباچے میں مثنویات میر اور میر کے عمومی کلام پر ایک بالکل نئے پہلو سے گفتگو کی گئی ہے۔
- جلد اول میں دیگر مضامین کے علاوہ شمس الرحمٰن فاروقی کا دیباچہ نما ایک نیا مضمون ''تمہید'' کے عنوان سے شامل ہے۔
- ان دونوں جلدوں کو بڑے سائز پر سفید کاغذ اور عمدہ کمپوزنگ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے اور سرورق ایسا ہے جو میر کے زمانے کی تہذیبی و ثقافتی روایت کی عکاسی کرتا ہے۔

کلیات میر (جلد اول و دوم) ملک کے تمام بڑے کتب فروشوں کے یہاں دستیاب ہے۔ اردو کونسل سے براہ راست بھی طلب کی جا سکتی ہے۔

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

علی احمد فاطمی

الہٰ آباد کا ادبی ماحول: منظر اور پس منظر

الہٰ آباد صوفی سنتوں کا شہر رہا ہے۔ مقدس دریاؤں کے سنگم نے اسے ایسی تہذیبی حیثیت بخشی کہ یہ رشیوں منیوں کا بھی سنگم بن گیا۔ ہر سال سنگم کے عوامی اجتماع نے اسے ایسا حسن بخشا کہ دور دراز سے لوگ آتے گئے اور بستے گئے۔ مسلم صوفیوں کی توجہ بھی اس شہر نے اپنی طرف کھینچی اور یہاں تصوف کے گھرانے بھی قائم ہوئے۔ صوفیوں کے چشتیہ، نقشبندیہ، سہروردیہ سلسلے کی بہت سی خانقاہیں اور دائرے قائم ہوئے۔ تہذیب، ثقافت اور ادب کے حوالے سے یہ دائرے کسی مخصوص مذہب تک محدود یا مشروط نہ تھے۔ یہاں ہر مذہب و ملت کے لوگ عقیدت و محبت سے جمع ہوتے۔ آگے چل کر ان دائروں میں سے بعض نے جنگِ آزادی میں اہم رول ادا کیا۔ شعر و سخن کے حوالے سے جو فضا ان دائروں میں قائم ہوئی وہ سارے شہر بلکہ قریبی قصبات جیسے جھونسی، کڑا، کراری، تارا وغیرہ تک پھیل گئی۔ الہٰ آباد یا دائرۂ الہٰ آباد کے اثرات لکھنؤ کے بعض نامور شعرا پر بھی پڑے مثلاً ناسخ لکھنوی کو دائرۂ شاہ اجمل کی تاریخ و تہذیب نے بے حد متاثر کیا۔ 1828 میں جب وہ نواب لکھنؤ کے عتاب سے شہر بدر کیے گئے تو وہ باقاعدہ الہٰ آباد آگئے اور برسوں دائرۂ شاہ اجمل میں قیام کیا۔ ان کا یہ شعر بیحد مشہور ہوا:

ہر پھر کے دائرے میں ہی رکھتا ہوں میں قدم
آئی کہاں سے گردشِ پرکار پاؤں میں

ناسخ کے قیام نے الہٰ آباد کی اردو تہذیب پر کیا اثر ڈالا، یہ بات اس وقت تک آسانی سے نہیں سمجھی جاسکتی جب تک کہ ناسخ سے قبل ان دائروں کے بزرگوں کے عربی، فارسی اور اردو شاعری کے مزاج و مذاق نیز ہندو تہذیب اور بھکتی تحریک کو بھی مختصراً نہ سمجھ لیں۔

الہٰ آباد کو سیاسی اہمیت اس وقت ملی جب مغلوں کی حکومت مضبوط ہوئی اور اس کے اثرات الہٰ آباد تک پھیلے۔ یہ زمانہ بھکتی تحریک کے عروج کا زمانہ تھا۔ بھکتی تحریک کے نظریات عوام میں اپنی جگہ بنا رہے تھے۔ ایسے میں تصوف کے وجدان اور بھکتی کے گیان دھیان کو ایک ہونے میں دیر نہ لگی کہ دونوں کا مطمحِ نظر انسان سے محبت کرنا اور ذات پات اور اونچ نیچ کے فرق کو کم کرنا تھا۔ سوامی رامانند جن کا تعلق الہٰ آباد سے ہی تھا ان کے خیالات و نظریات نے زور پکڑا۔ پھر کبیر جیسا شاعر مل جانے کے بعد تو بھکتی شاعری عوامی شاعری کے دکھ درد اور تجربے میں ڈھل گئی۔ کبیر الہٰ آباد کے نہ تھے لیکن ان کی انسان دوستی اور عوام دوستی کی گونج الہٰ آباد تک اس لیے زیادہ پہنچی کہ اس کے لیے یہاں کی صوفیانہ فضا زیادہ موافق تھی۔ چنانچہ کبیر بانی یا کبیر پنتھی کا دبستان الہٰ آباد میں بھی عام ہوا۔ یہ مختصر سا ذکر اس لیے ضروری تھا کیونکہ دائروں سے متعلق عربی و فارسی شعرا کی صوفیانہ شاعری بھکتی تحریک سے متاثر تھی۔ عابد حسین لکھتے ہیں:

''ہندوستان کی کئی ہزار سال کی تہذیبی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اس میں گوناگوں کثرت کے اندر وحدت کا جو باریک رشتہ موجود ہے وہ اربابِ قوت کے جبر و تشدد سے نہیں بلکہ عارفوں کے وجدان سے، فلسفیوں کی فکر سے، زاہدوں کی ریاضت سے اور فنکاروں کے تخیل سے پیدا ہوا ہے اور یہی وہ سادھن ہیں جن کے ذریعے سے اسے زیادہ وسیع، مضبوط اور پائدار بنایا جاسکتا ہے۔'' ایس رادھا کرشنن نے بھی کہا تھا:

''درحقیقت جو چیز پسندیدہ ہے وہ مذاہب کی ہم آہنگی ہے۔ نوعِ انسانی کے مختلف فرقے دولتِ خداداد اور ودیعتِ الٰہی ہیں۔ ان کے ساتھ محبت کا سلوک لازم ہے۔ ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ رحمتِ خداوندی ہر مذہب میں شامل حال ہے۔''

ایک بات الہٰ آباد کی اردو تہذیب کے حوالے سے اور تھی۔ بھکتی تہذیب اور صوفیانہ تہذیب کے حوالے سے الہٰ آباد دہلوی تہذیب کے زیادہ قریب رہا۔ بار بار دہلی کے اجڑنے اور بسنے کے واقعات فنا و بقا کے آثار سے زیادہ قریب دکھائی دیتے ہیں لیکن لکھنؤ کے قریب ہونے کی وجہ سے زبان و بیان کے معاملات لکھنوی لسانی تہذیب کے زیادہ قریب رہے۔ یہ ایک ایسا غیر ارادی اور لاشعوری عمل تھا جس کی وجہ سے الہٰ آباد کی اردو تہذیب اور لسانی کلچر دہلی اور لکھنؤ کے درمیان کچھ اس طرح پھنسا کہ اس کا اپنا کوئی لسانی کلچر نہ بن سکا۔ اکبر الہٰ آبادی کا ایک شعر ہے:

کچھ الہٰ آباد میں ساماں نہیں بہبود کے
یاں دھرا کیا ہے بجز اکبر کے اور امرود کے

سنجیدگی سے غور کیا جائے تو تاریخ یہی بتاتی ہے، بقول سید محمد عقیل:

''اردو ادب کی بساط کم و بیش الہٰ آباد میں اسی وقت بچھی جب دلی میں ریختہ گوئی کا عروج ہوا یعنی محمد شاہی دور۔ اگر امیر خاں انجام کے وہ اشعار جو تذکروں میں مل جاتے ہیں الحاقی نہیں ہیں تو یہیں سے اردو شاعری کا آغاز سمجھنا چاہیے۔''

اسی عہد میں شاہ ناصر افضلی کی ایک رباعی ملتی ہے۔ رباعی یہ ہے:

فرزندِ بوالحسن کو کیا ہے شہید آج
لعنت برستی ہے زفلک بر یزید آج
ہیہات شمر خنجر زہراب دار زد
برحلقِ پاک تشنہ زدستِ پلید آج

بقول ڈاکٹر اسلم الہٰ آبادی ''اس رباعی کی روشنی میں شاہ ناصر افضلی الہٰ آباد میں اردو کے سب سے پہلے شاعر نظر آتے ہیں۔ الہٰ آباد کے ابتدائی دور کے شعرا میں شاہ ناصر افضلی، شاہ غلام قطب الدین مصیب، شاہ محمد علیم بیتاب، منشی سداسکھ نثار، شاہ محمد اجمل، بھکاری داس عزیز، خواجہ بخش اللہ منتظر، جنوں، محزوں، وارث شامل ہیں۔''

شاہ علیم بیتاب فارسی میں شاعری کرتے تھے بعد میں اردو میں بھی کہا۔ اس عہد کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

تدبیر کے اثر سے میں اب ہاتھ دھو چکا
تقدیر میں مری جو لکھا تھا سو ہو چکا

بیتاب

ان کے قدموں میں لگی رہتی ہے دن رات حنا
خوب دنیا میں بسر کرتی ہے اوقات حنا

سداسکھ نثار

بے خود اتنا ہے کہ کچھ ایما نہ کچھ تقریر ہے
منتظر کے ہاتھ میں شاید تری تصویر ہے

خواجہ بخش منتظر

ملیں کیونکر بھلا اس شوخ طفلِ لاؤبالی سے
کہ سوتے سوتے جب چونکے تو تصویرِ خیالی سے

بھکاری داس عزیز

صنم اگرچہ میں عشقِ سیاہ رکھتا ہوں
بہر طرح تری زلفوں کی چاہ رکھتا ہوں

محزوں

آفتِ جاں ہوگئی آخر یہ بینائی مجھے
جو بلا کیسے سو ان آنکھوں نے دکھلائی مجھے

جنوں

پڑا ہے سنگ دلوں سے مقابلہ دل کا
نہ ٹوٹ جائے میں ڈرتا ہوں آبلہ دل کا

حسنین مولوی

یہ وہ شعرا تھے جنھوں نے فارسی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی شاعری کی۔ ان کی اردو شاعری پر دہلی کا اثر دکھائی دیتا ہے، شاید اس لیے بھی کہ جس زمانے کی یہ شاعری ہے اس زمانے تک مخصوص لکھنوی شاعری کا مزاج و مذاق ابھر کر سامنے نہ آیا تھا۔ الہٰ آباد کے دائروں اور خانقاہوں کا مزاج بھی وہی تھا، اگر آپ اجمل الہٰ آبادی، مصیب، عالی، وارث وغیرہ کا کلام ملاحظہ کریں تو ان سب کے ہاں تصوف کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ اگرچہ رفتہ رفتہ آتش و ناسخ کا رنگ بھی داخل ہو چلا تھا۔ اس ملے جلے رنگ کے دو اشعار ملاحظہ کیجیے:

سیاہ بخت کے گھر کون ہے جو لائے چراغ
مرے مزار پہ جلتا ہے دل، بجائے چراغ

مصیب

خانہ خراب ہو اس چاہت کا، دن کو چین نہ خواب ہے شب کو
آنکھ لگی اک پل نہ ہماری، جب سے تم سے لگائی آنکھیں

عالی

ایک خیال ہے کہ ناسخ کے یہاں آنے سے بہت کچھ بدل گیا۔ لئیق رضوی لکھتے ہیں:

''ناسخ کے قیام نے الہٰ آباد کی ادبی دنیا میں نئی روح پھونک دی۔ ادبی سرگرمیاں بڑھیں۔ شاعری میں صناعی کی کوششیں عام ہوئیں۔ الہٰ آباد کے شعرا پر پہلے دہلی اسکول کا اثر تھا لیکن ناسخ نے الہٰ آباد کے شعری منظرنامے میں لکھنوَ دبستان کے رنگ گھولے۔''

اس خیال سے صد فی صد اتفاق مشکل ہے لیکن یہ سچ ہے کہ ناسخ اور اس کے بعد منیر شکوہ آبادی کی آمد نے الہٰ آباد میں شعر وسخن کی ایک نئی محفل آراستہ کی۔ نشستیں مشاعرے عام ہونے لگے۔ بیرونی شعرا کی آمد اور صحبت سے جن شعرا نے نام کمائے ان میں لالہ سکھ رام آسان، محمد جان خاں حیرت، میر سجاد علی سجاد، اشرف علی خاں، فیاض علی خاں، وحید الہٰ آبادی، افسر الہٰ آبادی، اکبر الہٰ آبادی، وغیرہ نے الہٰ آباد کی ادبی تاریخ میں نمایاں جگہ بنائی۔ حیرت الہٰ آبادی کا یہ شعر تو ضرب المثل ہوگیا:

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں
سامان سو برس کے ہیں، کل کی خبر نہیں

وحید الہٰ آبادی، اکبر الہٰ آبادی کے استاد تھے اور آتش کے شاگرد۔ وحید کے یہ دو شعر بھی زبان زد ہیں:

میں نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

کچھ کہہ کے اس نے پھر مجھے دیوانہ کر دیا
اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا

اکبرالہٰ آبادی نے طنزیہ ومزاحیہ شاعری کا اپنا ایک الگ دبستان قائم کر دیا لیکن ابتداً وہ بھی الہٰ آباد کے دیگر شعرا کی طرح غزل کی شاعری کرتے تھے اور اس طرح کے شعر کہتے تھے:

کر دیا نزع نے واقف کہ یہ ہستی کیا تھی
ہوش آیا تو کھلا حال کی مستی کیا تھی
دلِ مایوس میں وہ شورشیں برپا نہیں ہوتیں
امیدیں اس قدر ٹوٹیں کہ اب پیدا نہیں ہوتیں
کیا ہی رہ رہ کے طبیعت مری گھبراتی ہے
موت آتی ہے شبِ ہجر نہ نیند آتی ہے

لیکن اکبر ملک و معاشرہ کے بدلتے بلکہ بگڑتے ہوئے حالات اور نوآبادیاتی نظام کی لعنتوں سے گھبرا کر طنزیہ ومزاحیہ شاعری کی طرف آگئے۔ صدیق الرحمٰن قدوائی کہتے ہیں:

''اکبر اس وقت تک اردو طنز ومزاح کے سب سے بڑے نمائندے ہیں۔ اکبر کے یہاں پہلی بار طنز ومزاح دونوں، شاعر کی ذات، تنگ اور محدود دنیا سے بلند ہوتے نظر آتے ہیں۔ ان کا یہ محض ایک انداز بیان ہی نہیں، وہ اسے سماجی تبدیلیوں کو سمجھنے اور سمجھانے کا اچھا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اس لیے ان کی شاعری میں ہنسوڑپن اور مسخرگی نہیں بلکہ سنجیدگی، شائستگی اور تفکر کی فضا چھائی ہوئی ملتی ہے۔''

پروفیسر سید محمد عقیل کا خیال ہے کہ ''طنز ومزاح کی شاعری میں یقیناً اکبر کو ایک پائنیر (Pioneer) کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ یہ آج تک اردو ادب کی طنزیہ ومزاحیہ تاریخ میں کوئی اکبرالہٰ آبادی کے رنگ اور طرز شاعری تک نہ پہنچ سکا۔'' لیکن عقیل صاحب ایک اور دلچسپ اور معنی خیز بات کرتے ہیں:

''تعجب کی بات ہے کہ اتنی پرانی وراثت رکھتے ہوئے بھی شاعری میں الہٰ آباد کا کوئی اپنا الگ رنگ کیوں نہ بن پایا۔ ان کی فکر میں دلی اور لکھنؤ ہی کے رنگوں کی جھلک ملتی ہے۔ جس طرح فنِ تاریخ نگاری اور علم تاریخ میں الہٰ آباد نے ایک اسکول کی حیثیت بنالی ہے اردو شعر وادب میں الہٰ آباد کو کسی اسکول کی حیثیت کیوں نہ حاصل ہوسکی۔''

یہ سوال بیحد اہم ہے جس کا جواب اس مختصر سے مقالے میں ممکن نہیں۔ بس اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ الہٰ آباد ہمیشہ مختلف زبانوں اور تہذیبوں کا سنگم رہا اس لیے شعر وادب میں بھی یہ ملے جلے عناصر کام کرتے رہے ہیں لیکن ان سب کے درمیان جو باغیانہ مزاج اور مزاحمتی رویہ ہے، بے نیازی اور قلندری ہے وہ اس کی اپنی ہے۔

1868 میں ہائی کورٹ، آگرہ سے الہٰ آباد منتقل ہوا۔ 1872 میں میور سنٹرل کالج قائم ہوا جو 1887 میں الہٰ آباد یونیورسٹی کی شکل میں تبدیل ہوگیا۔ ان دونوں اداروں نے وکالت، ثقافت اور سیاست کے کئی در کھولے۔ تعلیم و تعلم کے نئے دور کا آغاز ہوا۔ بنارس کے منشی پریم چند الہٰ آباد آئے اور نہ صرف الہٰ آباد یونیورسٹی سے بی.اے. کیا بلکہ ناول نگاری کا آغاز بھی اسی شہر سے کیا۔ شیخ مہدی حسن ناصری 1910 میں الہٰ آباد آئے اور یونیورسٹی سے بی.اے. کرنے کے بعد 1914 میں وہ میور سینٹرل کالج میں عربی، فارسی کے اسسٹنٹ پروفیسر ہوئے۔ مسلم بورڈنگ ہاؤس میں مشاعروں کی روایت کا آغاز انھی نے کیا۔ 1924 میں یونیورسٹی میں الگ شعبۂ اردو قائم ہوا۔ یہ ہندوستان کا پہلا شعبۂ اردو تھا جس کی سربراہی پروفیسر ضامن علی نے کی جو خود ایک اچھے شاعر تھے۔ اسی شعبے میں آگے چل کر اعجاز حسین، احتشام حسین، گیان چند جین، مسیح الزماں، سید محمد عقیل جیسے نامور اساتذہ ہوئے۔ طلبہ میں شمیم حنفی، بلونت سنگھ، رضیہ سجاد ظہیر، فضیل جعفری، اجمل اجملی، مجاور حسین رضوی، جعفر رضا، شکیل نوازش رضا، علی جاوید، احمد محفوظ وغیرہ کے علاوہ یونس پرویز، ایس ایم عباس، ریحانہ سلطان جیسے اداکار بھی اسی شعبے کے طالب علم رہے ہیں۔ کچھ اور بھی طلبہ ہیں جنھوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں حیثیت حاصل کی۔

1927 میں ہندوستانی اکادمی کی بنیاد پڑی جس کا مقصد ہندی اور اردو کو قریب لانا تھا۔ اس ادارے کا رسالہ ''ہندوستانی'' ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا اس کے پہلے ایڈیٹر اصغر گونڈوی تھے ان کا یہیں انتقال ہوا۔ کیڈگنج میں ان کا مزار ہے۔

1935 میں جب سجاد ظہیر اپنی تعلیم مکمل کر کے لندن سے ہندوستان لوٹے تو الہٰ آباد آئے، یہاں ان کے والد ہائی کورٹ میں وکالت کرتے تھے۔ انھوں نے بھی وکالت شروع کی لیکن جی نہ لگا کہ ان کا ذہن کچھ اور سوچ رہا تھا۔ اس سوچ کو عملی جامہ اس وقت ملا جب دسمبر 1935 میں انھوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی۔ 1941 میں الہٰ آباد کے چند معززین نے سرتیج بہادر سپرو کی قیادت میں ''انجمن روحِ ادب'' قائم کی جو مدتوں محفلوں اور مشاعروں کا اہتمام کرتی رہی۔ انجمن آج بھی ہے لیکن پہلے جیسی فعال نہیں۔ داغ اسکول کے استاد شاعر نوح ناروی نے یہیں شعر وسخن کی نئی بساط بچھائی۔ ان کے شاگردوں کی فہرست طویل ہے لیکن ان میں چند ایسے ہیں جو خاصے مشہور ہوئے مثلاً سکھدیو پرساد بسمل، محمود خاں رائے بریلوی، رادھے ناتھ کول گلشن وغیرہ۔

الہٰ آباد یونیورسٹی میں ملازمت مل جانے کے بعد فراق گورکھپوری الہٰ آباد

ہی کے ہو رہے اور یہیں سے ان کی الگ شناخت قائم ہوئی۔ انگریزی ادب کے مطالعے اور ہندو تہذیب کے مشاہدے نے ان کی شاعری میں نئے نئے پیکر تراشے:

دلوں میں تیرے تبسم کی یاد یوں آئی
کہ جگمگا اٹھیں جس طرح مندروں میں چراغ
الگ الگ بہتی رہتی ہے ہر انساں کی جیون دھارا
دیکھ ملیں کب آج کے بچھڑے، بڑھ کے لے لوں تیری بلائیں

فراق نے اپنی رباعیوں کے ذریعے بھی اپنی الگ پہچان بنائی جن میں شرنگار رس کے انوکھے مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ فراق ترقی پسند تحریک سے بھی وابستہ رہے اور الٰہ آباد میں اس کی بنیاد ڈالنے میں پیش پیش رہے۔ فراق اردو کے پہلے شاعر ہیں جنھیں گیان پیٹھ ایوارڈ ملا۔

سجاد ظہیر، فراق گورکھ پوری، اعجاز حسین، احمد علی کی کوششوں سے الٰہ آباد میں ترقی پسند شعرا کا ایک حلقہ بن گیا جن میں سب سے ذہین اور طباع شاعر تھے تیغ الٰہ آبادی۔ ایک زمانے میں ان کا یہ شعر بیحد مشہور ہوا:

انھی پتھروں پہ چل کر اگر آسکو تو آؤ
مرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

تقسیم کے بعد وہ جلد ہی پاکستان چلے گئے اور وہاں جا کر مصطفیٰ زیدی کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کے کئی شعری مجموعے اب کلیات کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ دیگر ترقی پسند شعرا میں معصوم رضا راہی، شبنم نقوی، اجمل اجملی، فاروق جنوں، اقبال ماہر، نصر قریشی، مظہر نسیم وغیرہ تھے جنھوں نے اس کارواں کو آگے بڑھایا۔

الٰہ آباد یونیورسٹی میں شعبۂ اردو اعجاز حسین کی کوششوں سے علمی و ادبی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ ان کے بعض شاگردوں جیسے احتشام حسین، وقار عظیم، سید محمد عقیل وغیرہ نے دنیائے تنقید میں بڑا نام پیدا کیا۔ بلونت سنگھ، رضیہ سجاد ظہیر نے افسانوں میں، اعجاز حسین نے خود بھی چند اچھے ڈرامے لکھے جو شعبۂ اردو میں کھیلے گئے۔ مجاز، آتش، اکبر وغیرہ پر لکھے گئے ڈرامے خاصے مشہور ہوئے۔ اُپیندر ناتھ اشک کے الٰہ آباد آجانے سے اردو ہندی کی محفلیں جاگ اٹھیں، ساتھ ہی تنازعات بھی کہ اشک کو تنازعات سے بڑا شغف تھا۔ اشک اور بلونت سنگھ اردو فکشن رائٹر تھے بعد میں ہندی کی طرف چلے گئے۔ احتشام حسین الٰہ آباد کے ہی نہیں پورے اردو ادب اور تنقید کے ایک بڑے ستون تھے۔ انھوں نے پوری ایک نسل کو متاثر کیا خصوصاً سید محمد عقیل، شمیم حنفی، شارب ردولوی، محمود الحسن رضوی وغیرہ احتشام حسین سے متاثر رہے۔ احتشام حسین کا سب سے زیادہ اثر سید محمد عقیل رضوی نے قبول کیا۔ مسیح الزماں، مجاور حسین رضوی، جعفر رضا، فضل امام وغیرہ پر بھی احتشام حسین کے اثرات ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی جدیدیت کے علم بردار بن کر سامنے آئے۔ آج جدید نقادوں میں ان کا نام سرفہرست ہے۔ انھوں نے الٰہ آباد میں جدید شاعروں کا ایک حلقہ بھی پیدا کیا۔ الٰہ آباد ترقی پسند میلانات کا شہر رہا ہے پھر بھی رئیس فراز، فرخ جعفری، عبدالحمید، تنویر سامانی، احمد محفوظ وغیرہ شعرائے جدیدیت کے حوالے سے ہی جانے گئے۔ فاروقی کے کارنامے ساری اردو دنیا میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ وہ اردو کے پہلے ادیب ہیں جنھیں سرسوتی ایوارڈ ملا ہے۔

نئی نسل میں نثر لکھنے والوں کی تشکیل نوازش رضا (جو بعد کو پاکستان چلے گئے) فخر الکریم، نظام صدیقی، علی احمد فاطمی وغیرہ شامل ہیں۔ اب یہاں مہدی جعفر اور چودھری ابن النصیر بھی اقامت پذیر ہیں۔ پروفیسر عبدالقادر جعفری اگرچہ فارسی کے استاد ہیں لیکن اردو کے ادیب کی حیثیت سے بھی ان کی پہچان ہے۔ فضل حسنین نے ڈراموں اور طنز و مزاح کی دنیا کا انتخاب کیا۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ افسانے کے شعبے میں اسرار گاندھی نے اپنے دو مجموعوں کے ذریعے اپنی پہچان بنائی ہے۔ ان کے علاوہ سہیل احمد زیدی، حبیب رہبر، حباب ہاشمی، نواب ہاشمی، طفیل احمد مدنی، راز الٰہ آبادی، ماہر الحمیدی، خان ارمان، انعام حنفی، محمود رمز، ضمیر احسن، ایم اے قدیر، افضل جائسی، اقبال دانش وغیرہ کے نام ہیں۔ ان کی شاعری میں کلاسکیت سے رشتہ بھی ہے اور جدیدیت کا رویہ بھی۔ عتیق الٰہ آبادی، اسلم الٰہ آبادی، احترام اسلام، نیر عاقل، انوار عباس، اختر عزیز، خواجہ جاوید اختر، جاوید شہرت، صالح ندیم، اشرف خیال، سنیل دانش وغیرہ نے اپنی شناخت قائم کی ہے۔ ایم اے قدیر ایک دانشور اور جاوید اختر ادبی رسالوں کے شاعر کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔ محلہ دریا آباد، رانی منڈی، دائرہ شاہ اجمل وغیرہ کی مذہبی محفلوں میں نعتیہ، مدحیہ، سلامیہ شاعری کرنے والے شعرا سامنے آرہے ہیں۔ ایسے شعرا میں حیدر زیدی، محمود رمز، عابد الٰہ آبادی، رونق صفی پوری، نایاب بلیاوی، ضیا دریا آبادی، قمر انور، انور عباس، حسنین مصطفیٰ آبادی، حسن انتظار وغیرہ ہیں۔

الٰہ آباد نے اردو کی ادبی صحافت میں بھی اچھا رول ادا کیا۔ پرانے رسالوں ''نسیاں'' اور ''ہندوستانی'' کے بعد اعجاز حسین نے ''کارواں''، ''بلونت سنگھ نے'' فسانہ،'' محمود احمد ہنر نے ''شاہکار''، ''عباس حسینی نے ''نکہت'' شمس الرحمٰن فاروقی نے ''شب خون''، علی احمد فاطمی نے ''نیا سفر''، ''انداز'' وغیرہ کے ذریعے الٰہ آباد کی ادبی صحافت کے کارواں کو آگے بڑھایا۔ شب خون بند ہوجانے کے بعد اب تین رسالے الٰہ آباد سے نکل رہے ہیں۔ نعیم اشفاق کا ''پہچان'' علی احمد فاطمی کا ''جوش بانی'' اور دانش الٰہ آبادی کا

"سبق اردو"۔

الہ آباد میں قدیم وجدید انجمنوں کی فہرست طویل ہے۔ آج جو انجمنیں متحرک ہیں ان میں انجمن ترقی پسند مصنفین "اقبال اکادمی، جوش سوسائٹی، ادارۂ فن وادب، اردو گھر وغیرہ ہیں۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ نیا الہ آباد پرانے الہ آباد سے مختلف ہے اور بجھا بجھا سا بھی۔ کچھ ہوسکتا ہے کہ یہ بات سچ ہو۔ سیاست اور صارفیت نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا ہے، سود وزیاں کے معاملات حاوی آگئے ہیں۔ ادب میں بھی نفع ونقصان کی کشاکش آگئی ہے۔ کچھ اور بھی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی اب اردو کی ادبی وتہذیبی سرگرمیوں کا مرکز نہیں رہا۔ ہندوستان اکادمی اب پورے طور پر ہندی اکادمی بن چکی ہے۔ جو نئے ادارے قائم ہوئے ہیں وہ سرکاری زیادہ ہیں۔ ہندی کی نئی نسل اردو سے نابلد ہے۔ ہائی کورٹ میں اردو ادب سے لگاؤ رکھنے والے وکیلوں کی تعداد کم ہوگئی ہے۔ سیاست سے دانشوری رخصت ہوچکی ہے۔ معاشی ضروریات اور اقتصادی فکروں نے دل ودماغ کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ سماج کی ناہمواریاں، حکومتوں کی بے اعتدالیاں، جس سے سماجی ماحول اور سروکار بدل گئے ہیں۔ جو لوگ ایسے سیاہ ماحول میں شعروادب کی شمع کو روشن کیے ہوئے ہیں وہ شاید اپنے بزرگوں سے زیادہ بڑا کام کررہے ہیں کہ موافق اور مناسب ماحول کے مقابلے میں ناموافق ماحول میں ادب کی تخلیق ایک غیر معمولی عمل ہے۔

□□□

پتہ:
Head Deptt. of Urdu,
Allahabad University,
Allahabad (U.P.)

منتخب التواریخ (جلد اوّل، دوم، سوم)

مؤلف: ملا عبدالقادر بدایونی / مترجم: ڈاکٹر علیم اشرف خاں

عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی نہ صرف باکمال شاعر تھے بلکہ تاریخ نویسی میں بھی انھیں ملکہ حاصل تھا۔ معروف مورخ ابوالفضل کے ہمعصر ہونے کے ساتھ ساتھ انھیں بھی اکبری دربار میں رسائی حاصل تھی۔ انھیں ترجمہ اور تالیف پر مامور کیا گیا تھا۔ اسی دوران انھوں نے تاریخ الفی، رزم نامہ، جامع رشیدی اور بحرالاسمار جیسی کتابیں لکھیں۔ اکبری عہد کی ساٹھ سالہ تاریخ سے آگاہی کے لیے ابوالفضل کے "اکبرنامہ" کے ساتھ ساتھ ملا عبدالقادر کی "منتخب التواریخ" (تین جلدوں میں) کا مطالعہ بھی ناگزیر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ملا عبدالقادر نے یہ تاریخ شاہی محل میں بیٹھ کر نہیں لکھی جو بادشاہ اکبر کی پسند وناپسند سے گزرتی بلکہ آزادانہ تحریر کی اور یہی آزادانہ رائے اس کتاب کو "اکبرنامہ" سے منفرد کرتی ہے۔

صفحات: جلد اوّل 409 / جلد دوم وسوم 620، قیمت: جلد اوّل -/335 روپے / جلد دوم وسوم 555 روپے

جتنے پاس اتنے دور

مصنف: دھیریندر سنگھ جفا

"جتنے پاس اتنے دور" انڈین فائٹر پائلٹ کی آپ بیتی ہے جو ناول کے اسلوب میں لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب دھیریندر سنگھ جفا نے پہلے انگریزی میں لکھی بعد میں ڈی گھانے اسے بنگلہ میں ترجمہ کیا، پھر ہندی ترجمہ خود مصنف نے اپنے دوست سید مزمل فدا کے تعاون سے کیا اور اب اردو ترجمہ جناب شاہد جمال نے کیا ہے جسے قومی اردو کونسل نے حال ہی میں شائع کیا ہے۔ اس آپ بیتی میں 1970 سے 1972 تک ہندوستان اور پاکستان کی جنگوں کے توسط سے تقسیم شدہ ہندوستان کے ٹوٹے بکھرے دلوں کی آہوں اور کراہوں کو بڑی صفائی اور صدق دلی سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اپنے ملک کی حفاظت اور انسانی رواداری کے باب میں ہمارے جذبے اور احساس پر گہرے اثرات مرتسم کرتی ہے۔

صفحات: 270، قیمت -/145 روپے

ابوبکر عباد

تنقید کا منصب

تنقید، فن پارے کے مطالعے کا وہ طریقہ ہے، جس کے ذریعے ان کی تفہیم و تحسین کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ تنقید ادب کو سمجھنے اور سمجھانے کی صلاحیت کو فروغ دیتی ہے اور قاری کو ادب شناسی کی راہ دکھاتی ہے۔ یہ آہستہ آہستہ قاری میں ایسا ذوق پیدا کر دیتی ہے کہ وہ ادب کی قدر و قیمت کا تعین کر سکے اور اس سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکے۔ تنقید فن پارے اور قاری کے درمیان نہ صرف رابطے کا کام دیتی ہے بلکہ دونوں کے درمیان مستحکم رشتہ قائم کرتی ہے، فن پارے کو جانچتی اور پرکھتی ہے، اس کی خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی کرتی ہے اور وہ اسباب دریافت کرتی ہے جن اسباب نے فنکار کو یہ کارنامہ پیش کرنے پر آمادہ کیا نیز تنقید یہ بھی طے کرتی ہے کہ اس کارنامے کو فن اور ادب کی دنیا میں کیا مرتبہ حاصل ہے۔ اعلیٰ درجے کی تنقید اچھے برے کا دوٹوک فیصلہ نہیں کرتی بلکہ فن پارے کی صراحت، اس کی تشریح اور ترجمانی اور بعض اوقات تحلیل و تجزیے سے کام لے کر قاری کی مدد کرتی ہے۔ بقول پروفیسر آل احمد سرور:

"اچھی تنقید تخلیقی ادب کی طرف مائل کرتی ہے۔ وہ خود تخلیقی ہوتی ہے.....وہ پڑھنے والے کے ذہن پر مہر نہیں لگاتی، اس کے ذہن کی تربیت کرتی ہے، تخلیقی ادب پر کوئی تنقید تخلیقی ادب سے بے نیاز نہیں کر سکتی۔ دونوں کے درمیان کوئی خلیج نہیں ہے۔ تخلیقی ادب میں تنقیدی شعور کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ تنقید خلاصہ یا تنقیص نہیں ہے مگر اس کا تخلیق کے بنیادی خیال تک پہنچنا ضروری ہے۔"(1)

بعض نقادوں کا خیال ہے کہ تنقید کو صرف خوبیوں سے سروکار رکھنا چاہیے اور بعض اس کے قائل ہیں کہ تنقید کا کام خامیوں سے خبردار کرنا ہے۔ لیکن تنقید نہ تو صرف تعریف ہے نہ محض تنقیص، بلکہ یہ دونوں پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد کسی فن پارے کی قدر و قیمت کا تعین کرتی ہے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد نے نقاد کو بجا طور پر مالی سے تشبیہ دی ہے۔ کہ جس طرح مالی چمن سے گھاس پھوس کو نکال پھینکتا ہے۔ پھولوں اور پودوں کی نگہداشت کرتا ہے اسی طرح نقاد اپنی تحریروں سے ایسی فضا پیدا کر دیتا ہے جو اعلیٰ درجے کے ادب کی تخلیق کے لیے سازگار ہو۔ وہ ایک طرف قاری کی ذہنی تربیت کرتا ہے تو دوسری طرف فنکار کا رفیق و مددگار ثابت ہوتا ہے۔

وسیع مطالعہ، اعتدال و توازن اور غیر جانبدارانہ رویہ نقاد کی بنیادی خصوصیات ہیں، کہ نقاد کا منصب نہ تو جج کا ہوتا ہے، نہ مفتی کا اور نہ ہی معلم اخلاق کا۔ نقاد فنکار سے مختلف ہوتے ہوئے بھی فنی کارنامے کے حسین اور پراثر پہلو کو نمایاں کرنے میں فنکار کا شریک بن جاتا ہے اور ضرورت کے وقت ان نقائص اور عیوب کو بھی روشن کر دیتا ہے جن سے وہ پڑھنے والوں کو بچانا چاہتا ہے۔ سید احتشام حسین لکھتے ہیں: "نقاد ادیب کے نقطۂ نظر اور فنی کارنامے کو سمجھتے ہوئے بہت کچھ اور بھی سمجھتا ہے اور ادب اور زندگی کے تعلق کا مطالعہ خاص طور سے کرتا ہے۔ اسی تعلق کی روشنی میں ادبی کارنامے کی اہمیت کا اندازہ لگاتا ہے۔ ادب کے خلوص کا پتہ چلاتا ہے، ادب کے بہترین اور پائیدار حصوں کی قدر و قیمت معین کرتا اور انھیں تمدن کا جزو بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ رطب و یابس میں تمیز کرنا، غیر مخلصانہ اور سچے ادب میں فرق پیدا کرنا، اجالے کو اندھیرے سے الگ کرنا نقاد کا کام ہے۔ ادیب خود مکمل طور پر اس کام کو انجام دے سکتے تو نقاد کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ چونکہ نقاد کا کام تخریب نہیں تنظیم، ترتیب، انتخاب اور تعمیر ہے۔ اگر نقاد خلوص سے کام لے تو وہ صالح ادب کی پیدائش میں معین بن جاتا ہے۔"(2)

ہم فن اور ادب کے عام تصور کو پیش نظر رکھیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ادب تخلیق کار کے شعور اور خیالات کا اظہار ہے جسے وہ دوسرے افراد تک پہنچانے کے لیے ایسے فنی ذرائع سے نمایاں کرتا ہے جسے وہ سمجھ سکیں اور جس سے وہ لطف حاصل کر سکیں یا کم سے کم سمجھنے کی کوشش کر سکیں۔ لیکن ادب کو صرف ادب کہہ دینے سے نہ تو اس کی بڑائی واضح ہوتی ہے اور نہ اس کی دوسری خصوصیات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس کی خصوصیات اور قدر و قیمت متعین کرنے کے لیے تنقید کی ضرورت پڑتی ہے۔ تنقید سب سے پہلے یہ دیکھتی ہے کہ فن پارے میں جو تجربہ پیش کیا گیا ہے اس کی کیا اہمیت ہے اور پھر یہ کہ فنکار اپنے تجربے کو پراثر انداز میں پیش کر سکا ہے یا نہیں اور چونکہ مواد اور ہیئت میں ایک طرح کا ناگزیر تعلق ہے اس لیے ہیئت کا مطالعہ بغیر مواد کے یا مواد کا مطالعہ بغیر ہیئت کے مکمل نہیں ہو سکتا۔ دوسرے مواد اور ہیئت کی اپنی الگ الگ اہمیت بھی ہے جسے ادب کی قدر و قیمت کے تعین میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن تنقید صرف مواد اور ہیئت سے ہی واسطہ نہیں رکھتی ہے بلکہ اظہار و بیان کی خوبیوں کی نشاندہی اور اس سے آگے بڑھ کر خیالات کا جائزہ بھی لیتی ہے اور ادب میں جن نظریات، خیالات اور تجربات کا اظہار کیا جاتا ہے ان کی بنا پر اس کی خوبی یا خرابی کے بارے میں رائے بھی قائم کرتی ہے۔ چنانچہ نقاد اپنے خیالات کا

اظہار اس طور کرتا ہے کہ اس میں کسی طرح کی غلط فہمی کا احتمال باقی نہ رہے۔ وہ اپنی تحریر وضاحت، صراحت اور پوری قطعیت کے ساتھ پیش کرتا ہے اور حوالوں اور مثالوں کے ذریعے اپنی بات کو مدلل اور زیادہ باوزن بناتا ہے۔

تنقید کو تخلیقی ادب کا بھی درجہ دیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ادب کے محرکات تک رسائی حاصل کرنا اس کے گوناگوں پہلوؤں کو گرفت میں لانا، ان کا انسان کے وسیع ذہنی و عملی تجربات کی روشنی میں جائزہ لینا اور پھر سب کو ایک نئی معنویت، ترتیب اور حسن کے ساتھ پیش کرنا تخلیقی عمل کی بہت سی خصوصیات کا حامل ہے۔ بقول آصف فرخی "تنقید اگر تخلیقی جوہر سے بے بہرہ ہو تو پھر "ہمیں مکتب و ہمیں ملا" ٹائپ کی سرگرمی بن کر کار طفلاں تمام کرتی رہتی ہے اور ادب کے تابع مہمل سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔" (3) لیکن تنقید کی تخلیقی صلاحیتیں ادب کے دائرے میں ہی اپنے کس بل دکھا سکتی ہیں۔ نشان زد رہے کہ تنقید کی تمام تر صلاحیتوں کو تسلیم کرنے کے باوجود، اس ناقابل تردید حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تنقید کا بنیادی مقصد و منصب ادب کو سمجھنا اور سمجھانا ہے، دوسرے تمام مقاصد اور تقاضے اسی محور کے گرد گھومتے ہیں۔

حواشی:

(1) تنقید کیا ہے، مکتبہ جامعہ دہلی، چوتھا ایڈیشن، دسمبر 1956، ص-196

(2) تنقیدی نظریات: مرتبہ سید احتشام حسین؛ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ، دوسرا ایڈیشن 1961، ص-28

(3) سوغات، ستمبر 1992، ص-144

□□□

پتہ:
Deptt. of Urdu, Faculty of Arts,
University of Delhi,
Delhi-110007

اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک

مصنف: خلیل الرحمٰن اعظمی

اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک خلیل الرحمٰن اعظمی کی تحقیقی اور تنقیدی کتاب ہے۔ اس کتاب میں تعارف اور مقدمے کے علاوہ تین ابواب ہیں، جو ترقی پسند مصنفین کی تحریک، ترقی پسند ادبی سرمائے کا جائزہ اور ترقی پسند تنقید ایک تجزیاتی مطالعہ پر مشتمل ہیں۔ رشید احمد صدیقی نے جو اس مقالے کے نگراں تھے، خلیل الرحمٰن اعظمی کی تلاش و تحقیق کے طریقۂ کار، قابلِ قدر مواد کی فراہمی اور اس کی ترتیب اور تجزیے کی تعریف و توصیف کی ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے جو مقدمہ لکھا ہے وہ کئی معنوں میں فکر انگیز ہے۔

صفحات: 410، قیمت: -/241 روپے

آزادی کے بعد اردو طنز و مزاح

مرتب: ابوالکلام قاسمی

پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے آزادی سے تقریباً ربع صدی قبل سے نصف صدی بعد تک کے معتبر طنزیہ و مزاحیہ مضمون نگاروں کو اس کتاب میں یکجا کیا ہے، جن میں انجم مانپوری، ملا رموزی، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، شوکت تھانوی، کنھیا لال کپور، فکر تونسوی، حسنین عظیم آبادی، ابراہیم جلیس، یوسف ناظم، احمد جمال پاشا، مجتبیٰ حسین، شفیقہ فرحت اور اعجاز علی ارشد جیسے 25 قلم کاروں کی تخلیقات شامل ہیں۔ اس انتخاب سے آزادی کے بعد لکھے جانے والے مزاحیہ ادبی سرمایے کی ارتقائی منازل کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ متن اردو اور ہندی دونوں رسم الخط میں ہے۔

صفحات: 655، قیمت: -/457 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب %45 اور %40 کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی 110066

معید رشیدی

وحشت کی غزل

بلا کی ہوتی ہے وحشت کی بھی غزل خوانی
کہ اک سرور سا ہوتا ہے اہلِ محفل کو

غزل داخلی، غنائی اور رمزیاتی صنفِ شاعری ہے۔ دوسری اصناف کے مقابلے یہ صنف سب سے بدنام مگر سب سے مقبول ہے۔ کسی نے اس کی گردن زنی کی وکالت کی تو کسی نے اسے نیم وحشی صنفِ سخن قرار دیا، لیکن اس کی مقبولیت میں کمی نہیں آئی، بلکہ مزید مقبول ہوتی گئی اور آج حال یہ ہے کہ سارے جہاں میں اس کی دھوم ہے۔ اس کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ عشق اس کا محبوب ترین موضوع ہے مگر بدلتے زمانے کے اثرات سے اس کا دامن اب کافی وسیع ہو چکا ہے۔ آج اس کے موضوعات محدود نہیں ہیں۔ ہاں اس کا ایک مخصوص مزاج ہے جس کی پاسداری ضروری ہے۔

رضا علی وحشت بیسویں صدی کے ممتاز شاعر ہیں۔ خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں:

''مولانا وحشت خوب سمجھتے تھے کہ روایتی غزل کا رس نچڑ چکا ہے۔ اب اس میں رنگینی خونِ جگر اور فکر و خیال ہی سے پیدا کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے ماضی و حال کا جائزہ لیا اور اپنے رنگ و آہنگ سے نیا راستہ نکالا جس میں ماضی کی توانائی، حال کا شعور اور مستقبل کے امکانات پوشیدہ ہیں۔''(1)

وحشت کے تین شعری مجموعے شائع ہوئے — ''دیوانِ وحشت''، ''ترانۂ وحشت'' اور ''نقوش و آثار''۔ تینوں مجموعوں کے مطالعے سے وحشت کے فنی اور فکری ارتقائی سفر کا اندازہ ہوتا ہے۔ ''دیوانِ وحشت'' میں خالص روایتی شاعری ملتی ہے۔ تقلیدِ غالب کے اشعار بھی اسی دیوان میں ملتے ہیں۔ ''ترانۂ وحشت'' اور ''نقوش و آثار'' میں ان کا اپنا رنگ صاف نظر آتا ہے۔ وحشت کی شاعری کا کینوس زیادہ وسیع نہیں مگر محدود بھی نہیں۔ شہرت طلبی سے دور رہ کر وہ خلوص کے ساتھ زبان و ادب کی خدمت کرتے رہے اور تا عمر اردو شاعری کی نوک پلک سنوارتے رہے۔ ان کی شاعری میں کلاسکیت اور روایت کی پاسداری کے ساتھ ساتھ ان کے زمانے کے جدید خیالات و تصورات بھی موجود ہیں۔ فن کے حوالے سے ان کا ذاتی نظریہ ہے جس پر وہ پوری طرح کاربند نظر آتے ہیں۔ اس سے قبل کہ ان کی غزل گوئی کا جائزہ لیا جائے، فن کے متعلق ان کا نظریہ کیا ہے، یہ جاننا ضروری ہے۔ آیئے خود انھی کے اقوال کی روشنی میں ان کے نظریۂ فن کا جائزہ لیں:

''حقیقت یہ ہے کہ میں پرانی لکیر کا فقیر ہوں۔ میں ہمیشہ امیر لکھنوی کا یہ شعر دہراتا ہوں جو میرے حسبِ حال ہے:

گذشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہوں میں
مٹا ہوا سا نشانِ سرِ مزار ہوں میں (2)

''... میں لڑکپن ہی سے اساتذہ کا کلام شوق سے پڑھا کرتا تھا اور بعض اشعار کا دل پر گہرا اثر ہو جاتا تھا۔ مومن کا تغزل میرے لیے بڑی جاذبیت رکھتا تھا اور اس کا تناسبِ الفاظ بھی مجھے بھلا لگتا تھا۔''(3)

''میں حضرتِ شمس کا شاگرد ہوں اور وہ داغ کے شاگرد تھے۔ اس تعلق کی بنا پر داغ کا احترام مجھ پر لازم ہو گیا۔ لیکن میں نے ان کے کلام کی تقلید نہیں کی۔''(4)

''غالب کی تقلید میں نے بے شک کی لیکن اس حد تک نہیں کہ میں کچھ اور بجز خیالات نہ پیش کر سکوں۔ میرے دیوان کا مطالعہ اگر گہرا ہو تو ظاہر کر دے گا کہ میں نے بھی کچھ نہ کچھ پیش کیا ہے۔ بقولِ غالب:

بیاورید گر ایں جا بود سخن دانے
غریبِ شہر سخن ہائے گفتنی دارد (5)

''آپ کا خیال صحیح ہے کہ میں حالی کے کلام سے بہت متاثر ہوا ہوں۔''

''شعر میں جب تک گرمی نہ ہو دل میں جگہ نہیں کرتے۔''(6)

''جب تک معنی آفرینی کی کوشش نہ ہو شاعری عبث ہے اور جب تک معنی میں لطافت و نزاکت نہ ہو تو شعر، شعر نہیں ہے۔ بہت کم شعرا اس بات کا خیال رکھتے ہیں اور یہ بات بھی ایسی ہے کہ کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ اس کے لیے نہایت نازک طبیعت درکار ہے۔''(7)

''کس قدر خونِ جگر پینا ہوتا ہے جب کہیں ایک مصرعۂ رنگین ہاتھ لگتا ہے یا ایک ترنم دل گداز زبان پر پیدا ہوتا ہے۔''(8)

''اب عام طور پر لوگوں کی توجہ ایک قسم کی ہرزہ سرائی کی جانب مائل ہو رہی ہے جسے نیچرل شاعری کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ

غزل میں اگر فطری جذبات ادا کیے جائیں تو نیچرل کیوں نہ کہلائے۔ کیا نیچرل شاعری کے یہی معنی ہیں کہ درخت اور پہاڑوں کی مصنوعی اور مقلدانہ تعریف کی جائے؟ شاعری نیچرل وہی ہے جس کی بنیاد حقیقت پر ہو۔ سعدی و حافظ، نظیری و عرفی، میر و غالب کے کلام میں سیکڑوں اشعار ایسے ملیں گے جو بالکل نیچر کی تصویر ہیں اور زبان زد خلائق ہیں۔ برخلاف اس کے وہ نظمیں جن سے آئے دن رسالوں اور اخبارات کے صفحے سیاہ کیے جاتے ہیں، نہ تو عام طور پر نیچرل ہوتی ہیں اور نہ ہی بسبب اپنی طوالت کے لوگوں کو یاد رہ سکتی ہیں۔''(9)

''جہاں تک ممکن ہو سکے جدتِ مضامین اور شستگی الفاظ کا خیال رکھیں اور پیش پا افتادہ خیالات کے نظم کرنے سے پرہیز کریں۔ مقلدانہ طور پر تشبیہات سے محترز رہنا ضرور ہے۔ دلی جذبات اور حقائق کا اظہار کرنا چاہیے۔''(10)

''غزل میں اختصار کا ضرور خیال رکھنا چاہیے۔ تیرہ چودہ شعر کافی ہوتے ہیں۔ سترہ سے تو ہرگز متجاوز نہ ہونا چاہیے۔ ایک غزل میں چار پانچ اچھے شعر نکلتے ہیں۔ باقی زیادہ تر حشو و زوائد سے پر ہوتے ہیں۔ پھر کیا ضرورت ہے کہ طولانی غزل سے صفحے پر کیے جائیں جن کے پڑھنے کو لوگ دردِ سر سمجھیں۔''(11)

''ایک اور بات جو غزل کی شان کو بڑھا دیتی ہے وہ اس کی زمین کا انتخاب ہے۔ پامال زمینوں میں خامہ فرسائی عبث ہے۔''(12)

''فرسودہ خیالات، اخلاق سوز اشارے اور مقلدانہ قافیہ پیمائی کب تک دلوں کو مائل کر سکتے تھے۔ انقلابات شروع ہو گئے۔ غزل کی صورت بدل گئی اور وہ مضامین جن پر غزل کا دارومدار تھا اب مکروہ سمجھے جانے لگے اور رفتہ رفتہ متروک ہو گئے۔''(13)

وحشت کے خطوط اور مضامین کے علاوہ ان کے اشعار میں بھی ان کا نظریۂ فن موجود ہے۔ آیئے اشعار کی روشنی میں ہم ان کے نظریۂ فن کو دیکھیں:

مطربِ خلد کیا سنائے وحشتِ خستہ کیا سنے
معتقدِ قدیم ہے زمزمۂ حجاز کا

دل و جاں سے وحشتِ بے نوا ہے شہید لذتِ شعر کا
کوئی خوش ہو یا نہ ہو اس کو کیا وہ ہے آپ اپنے ہنر سے خوش

خدا گواہ کہ ہوں ترجمانِ دل وحشت
کہے ہیں شعر، نہیں کی ہے شاعری میں نے

زنہار بارِ خاطرِ اہلِ سخن نہ ہو
وحشت غزل میں لطف رہے اختصار کا

وحشت، حالی کے تغزل سے متاثر ہیں، غالب کی شاعری کے دل دادہ ہیں اور داغ کی استادی کے معتقد ہیں۔ فن پر گرفت اور شاعری کے رموز و نکات سے گہری واقفیت، وحشت کو ہم عصروں میں ممتاز بنا دیتی ہے۔ وہ تقلید کرتے ہیں مگر ایک نئے طرز کے ساتھ، ایک نئے لطف اور ایک اچھوتے انداز کے ساتھ۔ وہ اپنے کلام کو پیچیدگی سے پاک رکھتے ہیں تاکہ حسنِ کلام برقرار رہے۔ ان کا ایقان ہے کہ کلام کی پیچیدگی، کلام کے حسن کو زائل کر دیتی ہے۔ غالب مشکل پسند طبیعت کے مالک تھے۔ وحشت نے ان کی تقلید کی لیکن ان کی مشکل پسندی سے اجتناب بھی کیا اور سلاست و فصاحت پر زور دیا۔ وہ زبان کے لطف کے زبردست حامی ہیں۔ وحشت کی نظر میں وہ شعر مکمل ہی نہیں جس میں معنی کا حسن اور زبان کی لطافت نہ ہو۔ اس معاملے میں ان کا نظریہ، یہ ہے:

پیچیدگی سے پاک رکھ اپنے کلام کو
وحشت سخن میں چاہیے لطفِ زباں رہے

وحشت کمالِ شعر فصاحت کا نام ہے
مضمون کے خیال میں لطفِ زباں نہ چھوڑ

وحشت مری نظر میں مکمل نہیں وہ شعر
جس میں کہ حسنِ معنی و لطفِ زباں نہ ہو

شاعری خیال کو لفظوں کا لباس پہنانے کا نام ہے۔ خیال کی اہمیت اپنی جگہ، مگر لباس کی زیبائش بھی ضروری ہے۔ ورنہ شعر کا لطف جاتا رہے گا۔

وحشت فن میں بدعت کے خلاف تھے اور تجربے کے نام پر فنی معیاروں سے کھلواڑ کے مخالف۔ مشاعروں میں غزل سرائی سے صرف اس لیے اجتناب کرتے رہے کہ وہاں پڑھی جانے والی شاعری فن کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتی تھی۔ وہاں انھیں اپنا کوئی ہم نوا نہیں ملتا تھا۔ وہ زبان و بیان میں تصرفہائے بیجا کا گلہ کرتے ہیں:

اور ہی ٹھہرا ہے وحشت اب تو معیارِ سخن
علم و فن کا تھا تجھے دعویٰ وہ باطل ہو گیا

غزل کا لطف ہے وابستۂ طرزِ کہن وحشت
خیالِ خاطرِ اصحابِ جدت آشنا کب تک

مشاعروں میں غزل سرائی نہیں مجھے اب پسند وحشت
نئے ہیں انداز شاعروں کے بدل گیا رنگ شاعری کا

ہائے کس قدر بدلا رنگِ شاعری وحشت
اب نظر نہیں آتا کوئی ہم زباں اپنا

ہے مجھے وحشت تصرفہائے بیجا کا گلہ
کس قدر ہے ان دنوں اردو زباں بدلی ہوئی

کیے کیا کیا تصرف شعر میں جدت پرستوں نے
ہے وحشت مدعا ان کا یہ فن برباد ہوجائے

وحشت کا نظریۂ فن قابلِ تتبع نہ بھی ہو تو قابلِ توجہ ضرور ہے۔ وحشت بہ ظاہر ''ادب برائے ادب'' کے قائل ہیں مگر ان کے ہاں ''ادب برائے زندگی'' کی جھلک بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

فصاحت، بلاغت اور سلاست وحشت کی شاعری کے امتیازی وصف ہیں۔ ان کی زبان میں پختگی ہے، روانی اور سلاست ہے۔ وحشت اپنی شاعری میں ندرتِ خیال کو فصاحت کا جامہ پہنا کر پیش کرتے ہیں۔ انھیں فکری سنجیدگی کے ساتھ زبان کا چٹخارا بھی عزیز ہے۔ لفظ و معنی کا حسن ان کے ہاں نکھر کر آتا ہے۔ خواجہ احمد فاروقی ان کی زبان دانی کا اعتراف کرتے ہیں:

''وحشت نے اپنی خدمات سے یہ ثابت کر دیا کہ اردو صرف دہلی اور لکھنؤ کی زبان نہیں، بلکہ پورا ہندوستان اس کی آغوش میں ہے اور بنگال میں بھی ایسی اردو لکھی جاسکتی ہے جس پر اہلِ دہلی و اہلِ لکھنؤ وجد کریں۔''(14)

وحشت کا شعور، ریاضت کی آگ میں تپ کر پختہ اور روایت کے سایے میں پرورش پا کر جوان ہوا۔ قدیم شعرا کے دواوین کے مطالعے نے جہاں ان کے شعور کو جولانی دی ہے وہیں ان کی زبان کو بھی صلابت بخشی ہے۔ انھیں اپنے کلام کی خوبیوں کا احساس ہے:

سن کے بولے کلام وحشت کا
اس کی خوبی میں کچھ کلام نہیں

داغ دہلوی اپنے وقت کے زبان و بیان کے امام تھے۔ پورا ہندوستان ان کی زبان دانی کا لوہا مانتا تھا۔ وحشت دعویٰ کرتے ہیں کہ اگر ابھی دنیا میں داغ موجود ہوتے تو وہ سب کو بتا دیتے کہ وحشت کی زبان کیسی ہے:

ابھی ہوتے اگر دنیا میں داغ دہلوی زندہ
تو وہ سب کو بتا دیتے، ہے وحشت کی زباں کیسی

وہ یہ بھی کہتے ہیں:

ہمارے ریختے میں فارسی کی شان ہے وحشت
کہیں ترکیب عرفی ہے، کہیں طرزِ فغانی ہے

وحشت نے اردو ادب کے ساتھ فارسی ادبیات کا بھی عمیق مطالعہ کیا تھا جس کی جھلک ان کے کلام میں جا بجا ملتی ہے۔ انھوں نے فارسی تراکیب کا استعمال خوبصورتی سے کیا ہے۔ اس ضمن میں وحشت نے بہت حد تک غالب کا اثر قبول کیا تھا لیکن یہ کہنا کہ وحشت نے محض غالب کی تقلید میں فارسی الفاظ و تراکیب کا استعمال کیا ہے، ان کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ غالب کی طرح وحشت نے بھی فارسی ادب کا عمیق مطالعہ کیا تھا اور انھوں نے فارسی میں شاعری بھی کی ہے۔ ان کا فارسی کلام دیوانِ اول میں موجود ہے۔ ان کی فارسی شاعری پر علامہ اقبال اپنے خیال کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''فارسی کلام بھی آپ کی طباعی کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔''(15)

ظفر علی خاں رقم طراز ہیں:

''مولانا وحشت ریختہ گوئی ہی میں ید طولیٰ نہیں رکھتے بلکہ آپ کا فارسی کلام بھی استادانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔''(16)

روایت ماضی سے حال تک کے مسلسل سفر کا نام ہے سماجی اطوار، رسم و رواج، تصورات و عقائد، اقدار وغیرہ روایت کا ناگزیر حصہ ہوتے ہیں۔ روایت کے مفہوم میں قدامت بھی شامل ہے۔ ادبی اصطلاح کے بطور روایت ماضی سے حال تک تسلسل کے ساتھ آنے والا وہ مذاقِ سلیم ہے جو ادبی معاشرے کی رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہوتا ہے۔ پروفیسر شمیم حنفی روایت کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''روایت کی حیثیت فن اور فکر کے ارتقا میں اساسی ہوتی ہے۔ اس حقیقت سے قطع نظر زندہ اور فعال حقیقتوں سے مملو روایت بیک وقت آئندہ حقیقتوں کو محرک کرتی اور اس کے امتحان کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ وہ ماضی و حال دونوں زمانوں میں ایک ساتھ زندہ رہتی ہے۔''(17)

ان بیانات کی روشنی میں ہم وحشت کی غزلوں کا تنقیدی جائزہ لیں تو وہ ہمیں روایت سے مکمل طور پر ہم آہنگ نظر آتی ہیں۔ روایت بہت سی جدتوں کو اپنے دامن میں سمیٹتی ہوئی آگے بڑھتی ہے اور ہر جدت اپنے استحکام اور استقلال کے بعد روایت کا حصہ بن جاتی ہے۔ روایت ادبی مزاج کی بنیاد ہے جس پر نئی نئی عمارتیں تعمیر ہوتی ہیں، شرط یہ ہے کہ ہر جدت یا ہر نیا تجربہ روایت سے استوار ہو۔ وحشت کی شاعری میں ہمیں یہی کیفیت ملتی ہے۔ وحشت کی روایت سے وابستگی ''دیوانِ وحشت'' کی پہلی غزل ہی میں محسوس کی جاسکتی ہے۔ ''دیوانِ وحشت'' کی پہلی غزل کا پہلا شعر ایک تلمیح ہے، ایسی تلمیح جو ہماری شاعری میں بہ کثرت پائی جاتی ہے۔ وحشت کا مطلع ہے:

آئینۂ خیال تھا عکس پذیر راز کا
طور شہید ہوگیا جلوۂ دل نواز کا

وحشت کی شاعری میں حریمِ ناز، رہگزرِ نیاز، خستگی کلیم، مژۂ دراز، دیر و کعبہ، جذبۂ شوق، بندۂ خانہ زاد، قدِ دراز، نرگسِ نیم باز، نگاہِ ناز وغیرہ الفاظ اپنے روایتی ہونے کا خود ہی اعلان کرتے ہیں۔ ان کا روایتی شعور کافی پختہ ہے۔ ساقی و میخانہ، شباب و شراب، بہار و خزاں، برق و آشیاں، ہجر و فراق کے

تلازمے روایت سے ان کی وابستگی ظاہر کرتے ہیں:

غضب ساقی کی بدمستی، ستم جوشِ شباب اس کا
چھلک پڑتا ہے اس کے ہاتھ سے جامِ شراب اس کا
تھا شوقِ پائے بوس بھی ہنگامہ آفریں
وہ شوخ خوابِ ناز سے بیدار ہوگیا
شہیدِ انتظارِ جلوۂ دیدارِ ساقی کو
حریفِ چشمِ وا گردیدۂ مشتاقِ ساغر تھا
ہے غارِ چشم اب خس و خاشاکِ آشیاں
ہنگامۂ بہار کی رخصت ہے، کیا کروں

عصری تناظر میں اخلاقی و جمالیاتی اقدار کے لحاظ سے روایت دو قسم کی ہوتی ہے۔ مثبت اور منفی، وحشت کی شاعرانہ عمارت جس روایت پر کھڑی ہے وہ مثبت ہے جو ماضی سے حال تک کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔ وحشت کی قادرالکلامی اپنی جگہ مسلم ہے۔ فنی اصول وضوابط پر ان کی گہری نظر ہے۔ عروض پر کامل دسترس ہے۔ کلاسیکی شعرا کے شانہ بہ شانہ چل کر انھوں نے اپنے کلام میں ایک خوش گوار فضا قائم کی ہے۔

بقولِ رشید احمد صدیقی، غزل اردو شاعری کی آبرو ہے۔ شاعری کی یہ صنف ہمیں ایرانی شاعری سے ورثے میں ملی ہے۔ غزل میں عشق کا جذبہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ عشق ہی کی وساطت سے حیات و کائنات کے اہم مسائل تک ہماری رسائی ہوتی ہے۔ شعرائے فارسی کی طرح شعرائے اردو نے بھی اس موضوعِ خاص میں ایسے ایسے لطیف مطالب و معانی پیدا کیے ہیں اور تخیلات و جذبات کی ایسی دنیائیں آباد کی ہیں کہ اس کا ہر پہلو روشن اور پرکشش بن گیا ہے۔

وحشت کی شاعری میں عشقیہ مضامین کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔ ان کی تخلیقی قوتیں عشق ہی سے متحرک ہوئی ہیں۔ ان کا تصورِ عشق شائستہ اور پختہ ہے۔ ان کا جمالیاتی شعور بیدار ہے۔ جذبۂ عشق کے اثرات ان کے ہاں نمایاں ہیں۔ محبت کی اثرانگیزی پر ان کا ایقان ہے:

جذبۂ عشق کا آخر کچھ اثر ہوتا ہے
یوں بظاہر نہ ہو محسوس مگر ہوتا ہے

اگر عشق نہ ہو تو حسن بے قدر ہے۔ حسن اور عشق دونوں لازم وملزوم ہیں۔ ایک کے بغیر دوسرا ادھورا ہے۔ معشوق کا غرور عاشق کی محبت کی دین ہے۔ عشق ہی کی وجہ سے حسن کی سرکار میں رونقیں ہیں:

ہے نیازِ بندگاں ہی سے غرور صاحبی
عشق ہی کی رونقیں ہیں حسن کی سرکار میں

اسی ضمن میں وحشت کے چند اور اشعار ملاحظہ فرمائیں:

بے دیکھے ہر کوئی ترا دیوانہ ہوگیا
افسوں ترے جمال کا افسانہ ہوگیا
میں کیا کہوں چمن آرائیاں تصور کی
خیالِ یار ہے گویا وصالِ یار مجھے
کون جانے کہ یہ کافر نظری کس کی ہے
خبر اتنی ہے کہ ثابت مرا ایماں نہ رہا
مجالِ ترکِ محبت نہ ایک بار ہوئی
خیالِ ترکِ محبت تو بار بار آیا

وحشت کی شاعری ابتذال سے پاک ہے۔ مسعود حسن رضوی ادیب کہتے ہیں:

''عشق پاک اور بے غرض محبت کا نام ہے..... محبت جب خود غرضی اور نفس پرستی کی سرحد سے گزر جاتی ہے تو عشق کا درجہ پاتی ہے۔''(18)

وحشت کے اشعار کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ ان کی شاعری ہوس پرستی سے پاک ہے اور ان کی محبت بے لوث ہے۔ پی بی شیلی نے کہا تھا:

"Our Sweetest songs are those that tell of saddest thought"

شاعری وہی اعلیٰ ہے جو غم زدہ خیالات کی ترجمانی کرے۔ ہماری غزلیہ شاعری کی تاریخ میں شاید ہی کوئی ایسا شاعر ملے جس نے غم کو اپنا موضوعِ سخن نہ بنایا ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی کے ہاں یہ زیادہ پایا جاتا ہے اور کسی کے ہاں کم۔ غزل غنائی اور داخلی صنفِ سخن ہے۔ داخلیت جس قدر زیادہ ہوگی شعر اتنا ہی اثر انگیز ہوگا اور دیرپا اثرات مرتسم کرے گا۔ اردو شعرا نے بڑی تعداد میں اس موضوعِ خاص پر طبع آزمائی کی ہے۔ بیسویں صدی میں فانی کے بعد وحشت نے اس روایت کو تقویت بخشی لیکن وحشت کا المیہ یہ ہے کہ ان کی شاعری کا تفصیلی مطالعہ نہیں کیا گیا اور کسی نے وحشت کی شاعری کے اس پہلو پر غور کرنے کی زحمت گوارہ نہ کی۔ جن لوگوں نے ''دیوانِ وحشت'' کا توجہ کے ساتھ مطالعہ کیا وہ ان کے فن کی داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔ حالی، شبلی، اقبال، حسرت، شرر، حسرت موہانی، نیاز فتحپوری اور عندلیب شادانی نے ان کے فن کا لوہا مانا۔ لیکن جن لوگوں نے دیوان کا سطحی مطالعہ کیا وہ ان کی شاعری کے مزاج سے ناآشنا رہے اور ان کی شاعری کے متعلق غلط رائیں قائم کرتے رہے۔ ان پر تقلیدِ غالب کا الزام لگا کر ان کی اہمیت کم کی گئی۔ بیشتر تاریخ نویسوں نے جب ادبِ اردو کی تاریخ لکھی تو وحشت کا نام تک نہیں لیا۔ وحشت کا ایک شعر ہے:

اللہ رے زورِ مجبوری خود مجھ کو حیرت ہوتی ہے
جو بار اٹھانا پڑتا ہے کیوں کر وہ اٹھایا جاتا ہے

آپ اس شعر پر نیاز فتح پوری کی داد سنیے:

"افسوس ہے کہ میں وحشت سے بہت دور ہوں ورنہ خود جاکر ان سے پوچھتا کہ اس شعر کی تخلیق کیوں کر ہوئی اور وہ کون سا حال تھا جو اس الہام پارے کے نزول کا باعث ہوا۔"(19)

وحشت کے چند اور شعر ملاحظہ کریں:

دل پھنکا جاتا ہے پر آہ کہاں کرتا ہوں
کس قدر پاس ترا سوزِ نہاں کرتا ہوں
اک زخم ہے کہ جس کو مرہم سے دشمنی ہے
اک درد ہے کہ جس کو پروا نہیں دوا کی
وہ آنسوؤں کی پہلی سی طغیانیاں کہاں
ندی کی ہے مثال کہ چڑھ کر اتر گئی
ٹپکتے جاتے ہیں آنسو، نہیں رکتے، نہیں تھمتے
یہ جو ہر خاک میں اک ایک پنہاں ہوتے جاتے ہیں

زندگی کو سنوارنے، اسے حسین و متین بنانے میں غم اہم کردار ادا کرتا ہے۔ غم انسان کو سنجیدہ بناتا ہے۔ وحشت تمام عمر زندگی کی تلخیوں سے نبردآزما رہے مگر کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لائے۔ خوشی خوشی مصائب کا استقبال کیا۔ انھیں درد میں مزہ ملتا ہے۔ انھیں دوا سے سروکار نہیں۔ وہ روتے ہیں مگر بغیر آنسوؤں کے۔ آنسوؤں کی نمائش ان کے نزدیک غم کی توہین ہے۔ ان کا غم دل کے نہاں خانے میں محفوظ رہتا ہے۔ انھیں رنج و الم عزیز ہیں اسی لیے وہ انھیں سینے سے لگا کر رکھتے ہیں۔ ان کے لیے غم میں بھی ایک سرور ہے، ایک لطف ہے، ایک خلش جو دلوں کے تاروں کو چھیڑ دیتی ہے:

اب یاس ہی پیامِ سکوں دے گی قلب کو
اب درد ہی سے درد کا درماں کریں گے ہم
مرہم کا ذکر کس نے عداوت سے کر دیا
یہ کیا نئی خلش مرے زخمِ کہن میں ہے
یہ کیوں کہوں کہ سوزِ دل اپنا عیاں نہ ہو
ہاں التزامِ نالہ و آہ و فغاں نہ ہو
ہم کو انجامِ دلِ ناشاداں معلوم ہے
کس قدر تاثیر رکھتی ہے فغاں، معلوم ہے
قفس میں عمر گزری نالہ و آہ و فغاں کرتے
ہم آخر کس توقع پر خیالِ آشیاں کرتے

وحشت کی غزلوں میں تصوف کا رنگ بھی ملتا ہے۔ چونکہ وہ روایت کے امین تھے اس لیے روایتی موضوعات ان کی شاعری کے لیے ناگزیر ہوگئے۔ انھوں نے صرف روایات کے لحاظ میں صوفیانہ اشعار کہے۔ وہ صوفی نہ تھے۔ تصوف کا تعلق عشقِ حقیقی سے ہے۔ عشقِ حقیقی سے مراد عشقِ خداوندی ہے۔ اس عشق میں محبوب و مطلوب ذاتِ باری ہے۔ عشقِ حقیقی میں ایک راستہ تو وہ ہے جو قربتِ الٰہی کے شوق میں معرفتِ ذات کی طرف جاتا ہے اور دوسرا وہ ہے جو کائنات کی ہر شے میں جمالِ خداوندی کا مشاہدہ کرتا ہے۔ دونوں حالتوں میں ایک پہلو مشترک ہے کہ عاشق اپنے محبوبِ حقیقی کی دید کا طالب ہوتا ہے اور یہ طلب جب اپنے درجۂ کمال پر پہنچی ہے تو ہر شے حسنِ حقیقی کا پرتو نظر آنے لگتا ہے۔ پرتوِ حسن کو نگاہوں سے چومنے کے شوق میں وہ ذرّے ذرّے سے محبت کرنے لگتا ہے۔

چوں کہ صوفیانہ اشعار وحشت نے روایت کی پاسداری میں کہے تھے۔ اس لیے یہاں وہ جدّت سے کام نہ لے سکے اور انھوں نے وہی مضامین باندھے جو قدما باندھتے آئے تھے۔ اس رنگ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دیر و حرم کی قید نہ تھی راہِ شوق میں
میں نے نمازِ عشق ادا کی جہاں ہوا
نکل سکا نہ کبھی حلقۂ مجاز سے میں
اگر چہ مجھ کو حقیقت نما مجاز رہا
بے خودیِ عشق نے مجھ کو دیا درسِ خودی
میں ہی میں ہوں ہر طرف، میرے سوا کوئی نہیں
محرک ہوگا شوقِ دید کا خود تیرا استغنا
یہ شعلہ اور بھڑکے گا صدائے لن ترانی سے

عام طور پر لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ وحشت کی شاعری عشق، تصوف اور دیگر روایتی موضوعات سے عبارت ہے۔ اس بات سے کم لوگ آشنا ہیں کہ انھوں نے سیاسی، ملی اور قومی شاعری بھی کی ہے۔ تغزل میں سیاست کی آمیزش ایک الگ ہی مزہ دیتی ہے۔ وحشت کے اشعار میں سیاسی رنگ کا اندازہ آسانی سے نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ وہ آخر تک سرکاری ملازم رہے۔ اس لیے سیاسی موضوعات پر کھل کر اظہارِ خیال کرنا ان کے لیے دشوار تھا۔ انھوں نے تشبیہات و استعارات کے پردے میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ ان کے زمانے میں پورے ملک میں انگریزوں کے خلاف فضا تیار ہو رہی تھی۔ حریت کے جذبے پروان چڑھ رہے تھے۔ لوگ آزاد ہندوستان کے خواب دیکھ رہے تھے، جس کے لیے قربانی درکار تھی۔ وحشت یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ آزادی

کی دیوی خون کا خراج ضرور لے گی۔ کہتے ہیں:

بہارِ گل، متقاضی ہے خونِ بلبل کی
کہ یہ بھی چاہیے رنگینیِ چمن کے لیے

وحشت کلکتہ کے رہنے والے تھے اور یہ شہر ان دنوں سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ان کی نظر کے سامنے کانگریس، مسلم لیگ اور خلافت تحریک پروان چڑھی۔ انگریزوں کو ملک سے باہر نکالنے کی ایک ہی صورت تھی کہ ہندو مسلم آپس میں متحد ہو جائیں، انگریز بھی سمجھتے تھے کہ اگر یہ دونوں فرقے متحد ہو گئے تو ان کا یہاں ٹکنا محال ہو جائے گا۔ لہٰذا انھوں نے دونوں فرقوں میں پھوٹ ڈالنی شروع کی۔ ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' ان کی پالیسی قرار پائی۔ ان حالات سے وحشت کا حساس دل متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ کہتے ہیں:

ترے غمزے لڑا دیں گے مسلماں کو مسلماں سے
ترے عشوے بھڑا دیں گے برہمن کو برہمن سے

انگریز ملک کی معیشت پر قابض تھے۔ زراعت اور صنعت و حرفت پر ان کی اجارہ داری تھی۔ ہندوستانیوں کو ملکی پیداوار سے محروم رکھا جا رہا تھا۔ ملکی چیزیں غیر ممالک بھیجی جا رہی تھیں۔ برطانوی حکومت کی لوٹ کھسوٹ سے وحشت کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا:

جگر لاؤں کہاں سے میں جو تاراجِ خزاں دیکھوں
ابھی آنکھوں نے کل رنگینیاں دیکھی ہیں گلشن کی

بالآخر ملک آزاد ہوا دو حصوں میں منقسم ہو کر۔ دونوں طرف کے لوگ ہجرت پر مجبور ہو گئے۔ مہاجرین کے لیے وحشت کا مشورہ دیکھیے:

بہتر یہی ہے اپنا سمجھ لیں اسے وطن
اب جائیں جس طرف کو نکل کر وطن سے ہم

سرسید، حالی اور شبلی نے جس نہج پر قوم و ملت کی اصلاح کی کوششیں کیں، وحشت بھی اسی نہج پر سوچتے ہیں۔ وہ لوگوں کو ان کی بے حسی کا احساس دلاتے ہیں۔ ان کے نزدیک عمل کے بغیر زندگی بے معنی ہے۔ وہ بامقصد زندگی کا درس دیتے ہیں جو عمل پیہم اور جہد مسلسل کے بغیر ممکن نہیں:

کبھی سوچا بھی تو نے زندگی کا مدعا کیا ہے
جو فقدانِ عمل ہے، زندگی پھر ایک دھوکا ہے
نہیں اک ذرہ بھی عالم میں جد و جہد سے خالی
کشاکش سعی کی ہے عام، گویا سب کو سودا ہے
فریب زندگی کھاتا رہے گا زندگی بھر تو
کہ مقصد زندگی کا جب ترے نزدیک عنقا ہے

یہاں وہ حالی، اقبال اور چکبست سے قریب نظر آتے ہیں۔ وحشت کی شاعری کا یہ حصہ ان کے زمانے کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔

وحشت نے جہاں دوسرے متقدمین کا اثر قبول کیا وہیں انھوں نے غالب کا بھی اثر قبول کیا۔ کلام غالب سے ان کا لگاؤ عشق کے درجے کو پہنچ گیا تھا۔ انھوں نے دوسرے اساتذہ کا اثر بھی قبول کیا ہے۔ لیکن سب سے انھیں زیادہ غالب نے متاثر کیا۔ اگر لکھنؤ میں عزیز لکھنوی نے تو کلکتے میں وحشت کلکتوی نے شعوری طور پر غالب کی تقلید کی۔ اس میں وحشت کو جو کامیابی ملی وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی وحشت کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''مولانا اگر انصاف سے دیکھیے تو مرزا کا تتبع کرنا درحقیقت ہم لوگوں کا حق تھا مگر آپ نے ہمارا یہ حق ہم سے چھین لیا ہے۔ تکلف برطرف اگر مرزا صاحب کے ان بلند اور اچھوتے خیالات کو جن میں وہ اپنے تمام معاصرین میں ممتاز تھے، مستثنیٰ کر لیا جائے تو آپ کے اردو دیوان کو بے شائبۂ تصنع ان کے کلام کا نمونہ قرار دینا ہرگز داخلِ مبالغہ نہیں ہو سکتا۔''(20)

علامہ شبلی نعمانی اپنے ایک مکتوب میں وحشت کو لکھتے ہیں:

''آپ کے کلام میں من حیث الاغلب جدت، ندرت اور چستی ہوتی ہے۔ غالب اور مومن کی ترکیبیں اور طرزِ ادا آپ سے خوب بن پڑتی ہیں۔''(21)

شوق قدوائی رقم طراز ہیں:

''آج کل ہندوستان میں حضرتِ غالب اور حضرت میر کی تقلید کرنے والے زبان کے دعوے سے اکثر پائے جاتے ہیں مگر کلام کے رنگ سے کم، میں نے کم کا لفظ صرف اس بنا پر لکھا ہے کہ پوری تقلید حضرتِ غالب کے رنگ کی حضرتِ وحشت ہی نے کی ہے اور ان کی ذاتِ واحد 'کم' ہی کے لفظ کی مصداق ہو سکتی ہے۔''(22)

ذوق کے شاگرد ظہیر دہلوی، وحشت کو ایک خط میں غالب ثانی کا لقب دیتے ہیں:

''آپ کا کلام بلاغت نظام دیکھ کر بہ خدائے لایزال کسی شاعر کا کلام نظر میں نہیں جچتا۔ غالب ثانی ہونے میں آپ کے کوئی کلام نہیں۔ خدا کی قدرت ہے ایسے ایسے باکمال ہندوستان میں چھپے بیٹھے ہیں۔''(23)

وحشت نے غالب کی تقلید اپنے ابتدائی زمانے میں شدت کے ساتھ کی لیکن بعد میں ان کا رنگِ سخن بدل گیا اور انھوں نے اپنے لیے الگ راہ نکالی۔ مگر اسے کیا کہا جائے کہ جب وحشت مقلد تھے تو پورا ہندوستان ان کے فن کی داد دے رہا تھا اور جب انھوں نے اپنی خلاقی کے نمونے دکھائے تو ناقدین نے

توجہ نہیں کی اور انھیں پوری طرح نظرانداز کردیا۔ وحشت کا تعلق بیسویں صدی سے ہے اور بیسویں صدی کے شعرا میں وحشت کو سب سے زیادہ نظرانداز کیا گیا۔ اس کی جو بھی وجہیں رہی ہوں، ضرورت اس بات کی ہے کہ وحشت کو وہ مقام دیا جائے جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔ حسرت موہانی نے وحشت کی زندگی ہی میں کہا تھا:

''مولوی رضا علی صاحب وحشت متوطن کلکتہ زمانہ موجودہ کے ان چند برگزیدہ شعرا میں سے ہیں جن کے حسنِ کلام پر اردو شاعری کو فخر کرنا چاہیے۔''(24)

عبدالحلیم شرران کے رنگِ خاص کے قائل ہیں:

''حضرت وحشت کی طبیعت شاعری کے لیے بہت مناسب واقع ہوئی ہے۔ کلام میں خاص رنگ اور خاص لطف ہے۔ پرانے مذاق کے نباہنے کے ساتھ جدید رنگ کی شوخیاں اور دلچسپیاں بھی پیدا کرنا حضرت وحشت کا خاص رنگ ہے۔''(25)

محشر لکھنوی کا خیال ہے:

''آپ کے کلام پر تنقیدی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب وحشت کو سرمایۂ شاعری من جانب اللہ عطا ہوا ہے جو مضمون ہے وہ موتی کی طرح صاف، جو تخیل ہے وہ بالکل پاک و پاکیزہ۔ یہی طریقہ بلاغت کی جان اور یہی انداز فصاحت کی روح ہے۔''(26)

اثر لکھنوی کی رائے دیکھیے:

''رنگِ غالب کو اتنی خوبی اور کامیابی سے برتنے والا اس دور میں ان کے سوا اور کوئی نہ تھا مگر خود ان کا بھی ایک خاص رنگ تھا..... کورانہ تقلید یا محض لفاظی سے کوسوں دور۔''(27)

اب دیکھیے خواجہ احمد فاروقی کیا کہتے ہیں:

''مولانا وحشت خوب سمجھتے تھے کہ روایتی غزل کا رس نچڑ چکا ہے۔ اب اس میں رنگینی خونِ جگر اور فکر و خیال ہی سے پیدا کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے ماضی و حال کا جائزہ لیا اور اپنے رنگ و آہنگ سے نیا راستہ نکالا جس میں ماضی کی توانائی، حال کا شعور اور مستقبل کے امکانات پوشیدہ ہیں۔''(28)

خواجہ احمد فاروقی کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ وحشت نے اپنی خلاقی کے ذریعے غزل کا احیا کیا۔ حسرت موہانی کی طرح انھوں نے بھی غزل ہی کو اپنا میدان بنایا اور تمام عمر اسی صنفِ خاص میں طبع آزمائی کرتے رہے۔ بنیادی طور پر ان کی غزل کا مزاج روایتی ہے مگر انھیں اس کا علم اچھی طرح ہے کہ روایت کی پاسداری، ولکیر کا فقیر، ہونے کا نام نہیں۔ ان کی شاعری طرزِ قدیم میں رنگِ جدید کی آمیزش سے عبارت ہے۔

طرز جدید میں ہے وہی شیوۂ قدیم
بھرتے ہیں جامِ نو کو شرابِ کہن سے ہم

وحشت نے قدیم و جدید کے امتزاج سے اپنی شاعری میں وہ رنگ و آہنگ پیدا کیا جو انھیں ان کے ہم عصروں میں ممتاز کرتا ہے۔ ایسے شعر وہی کہہ سکتے تھے:

تم مرے گھر کو اگر آکے نہ کرتے روشن
آتشِ شوق، چراغِ شبِ فرقت ہوتی

اللہ رے زورِ مجبوری خود مجھ کو حیرت ہوتی ہے
جو بار اٹھانا پڑتا ہے کیوں کر وہ اٹھایا جاتا ہے

وحشت کی شاعری کو سمجھنے کے لیے ذہنی سفر کو سمجھنا ضروری ہے۔ زمانے کے تغیر کے ساتھ ان کے مزاج میں بھی تبدیلی ہوئی اور یہ تبدیلی اپنے ہمراہ مختلف میلانات لائی۔ ''دیوانِ وحشت'' کے مقابلے میں ''ترانۂ وحشت'' اور ''نقوش و آثار'' کا مطالعہ کیجیے تو یہ تبدیلی صاف طور پر نظر آتی ہے۔ نیاز فتح پوری اس تبدیلی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جذبات و خیالات میں تغیر ہونا ضروری ہے۔ لیکن اگر رسالہ تجلی میں ان کی ایک غزل میری نگاہ سے نہ گزرتی تو شاید میں وحشت کی شاعری کے متعلق اسی خیال پر قائم رہتا کہ ان کا جو رنگ اب سے پچاس سال قبل تھا وہی اب بھی ہے.....ان کی جوانی کی شاعری کے سامنے تو لوگوں کا صرف سر جھکتا تھا لیکن اب ان کے اس رنگ کے سامنے روح دوزانو ہوتی ہے۔''(29)

ہم وحشت کی شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ ایک دور وہ جو ''دیوانِ وحشت'' (مطبوعہ 1910) سے کچھ پہلے اور بعد کا ہے۔ دوسرا دور ''ترانۂ وحشت'' (مرتبہ 1950 / مطبوعہ 1953) تک کا ہے اور آخری دوران کی وفات تک کا ہے۔ آخری دور کا کلام ''نقوش و آثار'' میں ملتا ہے۔ وحشت کبھی ترقی پسند ادبی تحریک سے وابستہ نہیں رہے، ان کے کلام کے ترقی پسندانہ پہلوؤں سے اغماض ناممکن ہے۔ بقول ل۔احمد اکبرآبادی:

''روایتی غزل اور حکیمانہ تفکر کے ساتھ وحشت کے یہاں ایک بالکل نئی چیز بھی نظر آتی ہے جو اساتذۂ متقدمین کے یہاں مفقود ہونے کے برابر ہے۔ یعنی اگر کسی کے ہاں نظر آ بھی جاتی ہے تو وہ غیر ارادی، غیر محسوس شدہ ہے۔ وحشت کے کلام میں دوسری تمام خصوصیات و شعری محاسن کے ساتھ فکر و خیال کا ترقی پسندانہ پہلو ملتا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ جس وقت ان کی شاعری کا شباب تھا شعر و ادب کے باب میں ترقی پسندی کی اصطلاح وضع کرنے کا خیال بھی کسی دماغ میں نہیں آیا تھا۔ اس اعتبار سے وحشت کو اگر اردو شعرا میں ترقی

پسندی کا امام کہا جائے تو بالکل حق بجانب ہوگا۔"(30)

روایات کی پاسداری کے باوجود وحشت کی شاعری اساتذۂ قدیم کے برعکس صرف حسن وعشق اور فراق ووصال کی داستان نہیں بلکہ نصیحت، فلسفہ، اخلاق، درسِ جہد، تلقینِ عمل، حب وطن اور قومی جذبات کا ایک جیتا جاگتا مرقع ہے۔ اس ضمن میں چند اشعار ملاحظہ ہوں:

طور دیکھے ہیں زمانے کے ہمارے دل نے
اب کہاں اس میں تمنا کا گزر ہوتا ہے

خیال تک نہ کیا اہلِ انجمن نے کبھی
تمام رات جلی شمع انجمن کے لیے

کچھ سمجھ کر ہی ہوا ہوں موجِ دریا کا حریف
ورنہ میں بھی جانتا ہوں عافیت ساحل میں ہے

ہماری دور بینی ہے ہمارے امن کی دشمن
نہ ہوتی فکرِ مستقبل تو عیشِ جاوداں کرتے

ہر بات میں زمانے کی تقلید کیوں کریں
سب ایک ہی روش پہ چلیں، کیا ضرور ہے

شرمندہ کیا جوہرِ بالغ نظری نے
اس جنس کو بازار میں پوچھا نہ کسی نے

جب اردو غزل پر تنقید کے تیر برس رہے تھے، اس وقت ایک طرف حسرت موہانی نے اور دوسری طرف وحشت کلکتوی نے غزل کی آبرو رکھ لی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انھیں وہ مقام دیا جائے جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔ خواجہ احمد فاروقی کے الفاظ میں:

"وحشت کے کمالات کا عدم اعتراف نہ صرف تاریخی غلطی ہے بلکہ ناسپاسی بھی ہے۔"(31)

حوالے:

1. مضمون وحشت کی انفرادیت، از خواجہ احمد فاروقی، مشمولہ، روح ادب، 1984
2. مکاتیب وحشت، ص-126
3. ایضاً، ص-129
4. ایضاً، ص-130
5. ایضاً
6. مضامین وحشت، ص-102
7. ایضاً، ص-82
8. ایضاً، ص-82
9. ایضاً، ص-109
10. ایضاً، ص-154-155
11. ایضاً، ص-155
12. ایضاً، ص-156
13. ایضاً، ص-170
14. روح ادب، 1984
15. خط بنام وحشت، مشمولہ دیوان وحشت، مطبوعہ 1910
16. ایضاً
17. شعر وحکمت، حیدرآباد، شمارہ نمبر 2، ص-20
18. ہماری شاعری، از مسعود حسن رضوی ادیب، ص:201
19. مالہ وماعلیہ، نگار، جون 1946
20. مشمولہ دیوان وحشت، مطبوعہ 1910
21. ایضاً
22. ایضاً
23. ایضاً
24. اردوئے معلی، اپریل 1910
25. دلگداز لکھنؤ، اپریل-1910
26. رسالہ معیار لکھنؤ مئی-1910
27. مہرنیم روز، کراچی (وحشت نمبر)، ص-5
28. مضمون وحشت کی انفرادیت، از خواجہ احمد فاروقی، مشمولہ، روح ادب، 1984
29. نگار لکھنؤ، جون 1946
30. مغربی بنگال (وحشت نمبر، 1994، ص-17
31. مضمون وحشت کی انفرادیت، از خواجہ احمد فاروقی، مشمولہ روح ادب، 1984

❑❑❑

پتہ:
142, Jhelum, JNU,
New Delhi-110067

قومی اردو کونسل اور ماہ نامہ "اردو دنیا" اور سہ ماہی "فکر و تحقیق" سے خط و کتابت
بذریعہ ای میل اب اس پتے پر کریں۔
Email:urduduniyancpul@yahoo.co.in

محمد یحییٰ جمیل

پتھر بولتے ہیں

پتھروں میں کچھ پتھر ایسے ہوتے ہیں جو بولتے ہیں اور جب وہ بولتے ہیں تو وادی سندھ کی تہذیب سے برطانوی دور تک پھیلی ہندوستان کی تاریخ کے ان گوشوں کو بھی زبان مل جاتی ہے جن کے ہونٹوں پر وقت نے مہر لگا رکھی ہے۔

انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں ایک انگریز فوجی انجینئر الیگزینڈر کننگھم نے وائسرائے لارڈ کیننگ سے ہندوستان کے آثار قدیمہ کی تحقیقات کے لیے ایک پروگرام مرتب کرنے کی درخواست کی۔ ان کوششوں سے آخر کار 1861 میں ''آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا'' کے نام سے ایک محکمے کا قیام عمل میں آیا اور کننگھم ہی اس کا پہلا ڈائرکٹر نامزد ہوا۔ کننگھم نے بڑی جاں فشانی سے اپنی خدمات انجام دیں۔ اس نے کئی اہم عمارتوں، کتبوں، مجسموں اور سکّوں کو ڈھونڈ نکالا اور ان پر مفصل مقالات لکھ کر ان کی قدر و قیمت کو واضح کیا۔

کننگھم کو کتبوں کی نقلیں حاصل کرنے اور انھیں پڑھنے میں بے حد دلچسپی تھی۔ اس نے دیکھا کہ برصغیر ہند میں بے شمار کتبے بکھرے پڑے ہیں۔ لہٰذا 3 اکتوبر 1881 کو اس نے حکومت کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ کتبوں کی بہتات کے پیش نظر کتبہ شناسی کے لیے ایک الگ محکمہ قائم کیا جائے۔ حکومت برطانیہ نے یہ تجویز قبول کرتے ہوئے 17 جنوری 1883 کو کتبہ شناسی کا ایک شعبہ قائم کر دیا اور جان ایف فلیٹ کو پہلا سرکاری ماہر کتبات (Epigraphist) مقرر کیا۔

علم کتبہ شناسی، قدیم تحریریں پڑھنے اور ان کا مطالعہ کرنے سے عبارت ہے۔ یہ تحریریں براہمی، خروشتی، سنسکرت، کنڑ، تمل، تلگو، ملیالم، عربی، فارسی، اردو اور دیگر علاقائی اور مقامی زبانوں میں عموماً پتھروں، دھات کی تختیوں، برتنوں، سکّوں، مہروں وغیرہ پر کندہ ہیں۔ کتبات جو تاریخ کا سب سے معتبر ماخذ ہیں، کتابوں اور روایتوں میں پہلے سے موجود تاریخ کی توثیق بھی کرتے ہیں اور ایسے تاریخی حقائق کا پتہ بھی دیتے ہیں جن کا ذکر کتابوں میں نہیں ملتا۔ اس طرح تاریخ کی گم شدہ کڑیوں کو جوڑ کر یہ کتبات ہماری تہذیب و تمدن کی ابتدا اور اس کے فروغ کی گتھیاں سلجھانے میں بڑے مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

1883 کے بعد کتبوں کا مطالعہ پوری سنجیدگی اور انہماک سے کیا جانے لگا۔ یوں تو ہندوستان میں عربی فارسی کتبوں کا مطالعہ 1784 میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے قیام کے بعد سے ہی شروع ہو چکا تھا اور مرزا سنگین بیگ کی کتاب ''سیر المنازل'' (فارسی) اور سرسید احمد خاں کی کتاب ''آثار الصنادید'' (اردو) تو اس سلسلے میں میل کے پتھر کی حیثیت رکھتی ہیں، لیکن اب اسے حکومت کا تعاون بھی حاصل ہے۔ اپی گرافی، برانچ بھی مطالعے کی آسانی کے لیے لسانی اعتبار سے تین ذیلی شاخوں میں منقسم ہوگئی۔ ایک قدیم ہندوستان کی زبانوں کا شعبہ بنا جس میں سنسکرت، پالی، پراکرت وغیرہ شامل تھیں۔ دوسرے شعبے میں جنوبی ہند کی دراوڑی زبانیں مثلاً تمل، تلگو، کنڑ، ملیالم رکھی گئیں اور عہد وسطیٰ میں رائج عربی، فارسی اور اردو زبانوں کے لیے ایک تیسرا شعبہ قائم ہوا۔

دریافت شدہ کتبوں کی تفصیلات جرنل اینڈ پروسیڈنگز آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں شائع کی جاتی تھیں۔ اسی پروسیڈنگ نے 1892 میں اپی گرافیا انڈیکا کی شکل اختیار کی۔ اپی گرافیا انڈیکا میں عربی اور فارسی کتبوں کی کثیر تعداد کی وجہ سے 1907 میں اپی گرافیا انڈو مسلیکا (EIM) نامی ایک علاحدہ جرنل جاری کیا گیا اور تین شماروں کے بعد ڈاکٹر غلام یزدانی کو اس کی ادارتی ذمے داریاں سونپ دی گئیں جو نظام حیدرآباد کے محکمۂ آثار قدیمہ کے ڈائرکٹر اور برطانوی حکومت ہند کے اعزازی مسلم کتبہ شناس تھے۔ ڈاکٹر غلام یزدانی نے 14-1913 سے 40-1939 تک EIM کے پندرہ شمارے ترتیب دیے۔ 1946 میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنگ کا مستقل عہدہ تشکیل دیا گیا جس پر 1949 میں مولوی محمد اشرف حسین کا تقرر ہوا۔ مولوی محمد اشرف حسین کی ادارت کے دوران اس جرنل کا نام تبدیل کر کے اپی گرافیا انڈیکا عربک اینڈ پرشین سپلمنٹ EIAPS رکھ دیا گیا۔ مولوی صاحب کے بعد 1953 میں ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی نے اس عہدے کی ذمے داریاں سنبھالیں اور اپنی خداداد صلاحیتوں سے محکمۂ کتبہ شناسی کو بڑی وسعت دی۔ ڈاکٹر دیسائی کے زمانے میں ہی، 1961 سے EIAPS سالنامہ ہوگیا۔ EIAPS کے 1977 کے شمارے تک تقریباً دو ہزار عربی فارسی کے تاریخی اہمیت والے کتبوں پر تحقیقی مقالات لکھے جا چکے ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

ہندوستان میں عربی، فارسی کتبے 12ویں صدی عیسوی کے وسط سے دستیاب ہوتے ہیں۔ لیکن یہ وہ کتبے ہیں جو مسلمانوں کے باقاعدہ اقتدار کے قیام کے بعد نصب کیے گئے۔ یہاں ایک دلچسپ حقیقت یہ بھی ہے کہ مسلم دور اقتدار سے قبل ہندوستان کے مغربی ساحل پر گجرات اور جنوبی ہند (کیرلہ) میں عرب تاجروں کے لوح مزار ملتے ہیں، جو عربی زبان میں ہیں۔ ان کا رسم خط

بھی کوئی ہے جو کتبات کی قدامت پر دلالت کرتا ہے۔ آج تک دستیاب ہوئے کتبوں میں سب سے قدیم کتبہ 1079 کا ہے جو جنوبی ہند کے "بالیا پٹم" علاقے سے حاصل ہوا ہے۔ فارسی زبان چونکہ ساڑھے چھ سو سال تک ہندوستان کی سرکاری زبان رہی ہے اس لیے بیش تر کتبے اسی زبان میں پائے جاتے ہیں۔ بے شمار کتبوں پر فارسی کے ساتھ علاقائی زبانوں میں بھی تحریریں کندہ ہیں۔ یہ دو، تین اور چار زبانوں والے کتبے ثابت کرتے ہیں کہ مسلم بادشاہوں نے علاقائی زبانوں کے ساتھ کسی قسم کا کوئی تعصب نہیں برتا۔ ایسے کتبوں کی بھی کوئی کمی نہیں ہے جو مذہبی رواداری اور آپسی بھائی چارے کی بہترین مثالیں پیش کرتے ہیں۔ ان کتبوں سے گنگا جمنی تہذیب کی حفاظت کے لیے دیوار چین کی مانند ایک مضبوط دیوار بنائی جاسکتی ہے۔

1958 سے محکمۂ آثار قدیمۂ ہند کی اپی گرافی برانچ کا ہیڈ کوارٹر ناگپور ہے۔ یہاں عربی، فارسی، اردو کے تقریباً 15000 کتبوں کی نقلیں محفوظ ہیں۔ اب تک دستیاب ہوئے کتبوں میں سب سے زیادہ کتبے صوبۂ اترپردیش سے ملے ہیں۔ یہ کل کتبوں کا 21.4% ہیں۔ دوسرے نمبر پر مہاراشٹر ہے جہاں سے 14% کتبے ملے ہیں۔ اسی طرح گجرات سے 9% سے زائد، آندھرا پردیش اور مدھیہ پردیش سے تقریباً 9%، راجستھان سے 8%، کرناٹک سے 7%، بہار، مغربی بنگال اور کشمیر سے 4%، تمل ناڈو سے 2.55%، ہریانہ اور دہلی سے 2% کتبے ملے ہیں۔ کتبوں کی نقل یا بالفاظ دیگر ان کا چربہ اتارنے کا ایک مخصوص طریقہ ہے جسے انگریزی میں اسٹیمپ پیج میکنگ (Estamp Page Making) کہتے ہیں۔ اس میں ایک مخصوص کاغذ کو کتبے پر رکھ کر اوپر سے سیاہی پھیلائی جاتی ہے اور اس طریقے سے پھیلائی جاتی ہے کہ کتبے کا ہو بہو عکس اس کاغذ پر بن جاتا ہے۔ اس سے رسم خط کی تمام خصوصیات (Palaeographical Features) بھی محفوظ ہوجاتی ہیں۔ سال بھر میں نقل شدہ سارے کتبوں کی عبارتیں انگریزی میں منتقل کیے جانے کے بعد محکمے کے جرنل اینول رپورٹ آن انڈین اپی گرافی (ARIE) میں شائع کی جاتی ہیں۔ اس میں بھی زبانوں کے کتبوں کا خلاصہ شامل ہوتا ہے۔

یہ کتبے، جو تاریخی، معاشرتی، تہذیبی، سیاسی، مذہبی اور انتظامی امور کے مطالعے کے پیش نظر زبردست اہمیت کے حامل ہیں، سب سے زیادہ مسجدوں، خانقاہوں اور مقبروں پر دستیاب ہوتے ہیں۔ بعد ازاں قلعوں اور محلوں پر ملتے ہیں اور پھر عوامی عمارات مثلاً کنووں، مسافر خانوں اور حوضوں پر پائے جاتے ہیں۔ تعداد میں کم سہی ایسے مخصوص کتبات بھی موجود ہیں جو لوگوں کی نجی املاک کی طرف نشان دہی کرتے ہیں۔

یہ کتبے ماضی کے واقعات کے امین ہی نہیں، فن لطیف کے بھی بہترین نمونے ہیں۔ فن خطاطی سے آراستہ یہ کتبے اسلامی تعمیرات کے حسن میں چار چاند لگا دیتے ہیں۔ مسلم حکمرانوں اور امیروں نے فن خطاطی اور طغرہ نویسی کی خوب سرپرستی کی جس کا واضح اثر کتبات پر دیکھا جاسکتا ہے۔ دہلی کی قوۃ الاسلام مسجد اور قطب مینار، پانڈوا (مغربی بنگال) کی آدینہ مسجد، احمد آباد (گجرات) کی جامع مسجد، حیدرآباد اور گولکنڈہ کی عمارتیں، سکندرہ میں اکبر کا مقبرہ اور آگرے کا تاج محل ان عمارتوں میں سے چند ہیں جن پر ہندوستان کے دلکش ترین کتبے نصب ہیں۔ کتبات میں خط کوفی، خط نسخ، خط ثلث اور خط نستعلیق مستعمل رہے ہیں۔ عہد مغلیہ میں کتبہ نویسی کے لیے خط نستعلیق ہی زیادہ پسندیدہ رہا ہے۔

ان کتبوں کا مطالعہ ایک طرف علاقائی اور زمانی لحاظ سے خطاطوں کے بارے میں معلومات دیتا ہے تو دوسری طرف ان شعرا کے متعلق بھی تفصیلات مہیا کرتا ہے جن کا کلام کتبوں کی عبارتوں میں شامل ہے۔ بعض کتبوں پر اپنے اپنے وقت کے فرمانرواؤں کا کلام بھی اہل نظر کی نگاہوں کو خیرہ کرتا ہے۔ ان میں علی عادل شاہ دوم (1656-1671)، بہادر شاہ ثانی (1837-1857) اور نواب واجد علی شاہ (1848-1856) وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔

عربی، فارسی اور اردو کتبوں میں معیاری شعروں اور فن تاریخ گوئی کا بے نظیر خزانہ پوشیدہ ہے۔ اس طرح ادبی اعتبار سے بھی ان کی منفرد حیثیت ہے۔ یہ کتبات ہندوستانیوں کی ان خدمات کے بھی آئینہ دار ہیں جو انھوں نے اپنے ملک میں فارسی زبان کی آبیاری کے سلسلے میں انجام دی ہیں۔

ابتدا میں ان کتبوں میں ہجری سنہ کا استعمال اعداد کی شکل میں کیا جاتا تھا۔ 15ویں عیسوی کے بعد سے کتبوں میں ابجدی طریقے سے تاریخ کہنے کا رجحان بڑھنے لگا تھا اور واقعات کی تاریخیں فن تاریخ گوئی کی مدد سے قرآن کی آیتوں اور مصرعوں میں مضمر کی جانے لگی تھیں۔ وضاحت کے لیے الٰہ آباد (اترپردیش) کے خسرو باغ کا ایک کتبہ ملاحظہ فرمائیں، جو شہزادہ سلیم کی بیگم شاہ بیگم کی قبر پر واقع ہے:

اللہ اکبر

چوں چرخ فلک زگردش خود آشفت
در زیر زمیں آئینۂ مہ بنہفت
تاریخ وفات شاہ بیگم جستم
از غیب ملک بخلد شد بیگم گفت

(لکاتبۂ عبداللہ مشکین قلم جہانگیر شاہی)

قطعے کے چوتھے مصرعے سے تاریخ وفات بطریقۂ ابجد 1012ھ/1604ء اس طرح نکلتی ہے۔

بخلد شد بیگم	م	گ	ے	ب	د	ش	د	ل	خ	ب
1012	= 40	+20	+10	+2	+4	+300	+4	+30	+600	+2

کتبوں میں سنہ ہجری کے ساتھ سنہ جلوس کا استعمال بھی ہوا ہے، جس کا آغاز سلاطین گجرات نے کیا۔ اسی طرح شمسی سنہ کا استعمال گاہے بگاہے چودھویں صدی عیسوی کے وسط سے دکھائی دیتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ عربی، فارسی اور اردو کے کتبے ہمیں اپنے بزرگوں پر ناز کرنے کا بہترین جواز فراہم کرتے ہیں لیکن ضرورت اس بات کو سمجھنے کی ہے کہ صدیوں بعد جب ''چپ'' (Chip) کی زبانی آنے والی نسلیں ہمارے کارنامے سنیں تو ان کے سر بھی فخر سے اونچے ہی ہوں، شرم سے نہ جھکیں۔

ماخذ:

1. Monumental Islamic Calligraphy from India, W.E. Begley, 1985, USA
2. In Quest of the past, Dr. M.I. Quddusi, Dr. P.K. Mishra & Dr. V. Shivanand, 2001, Nagpur.

□□□

پتہ:
Persian Dept.
Smt. Kesharbai Lahoti Mahavidyalay
Post Shivaji Nagar, Amravati-444603 (MS)

تحقیق کا فن

مصنف: گیان چند جین

اردو میں اصولِ تحقیق پر اگرچہ متعدد کتابیں آچکی ہیں لیکن ان میں اس کتاب کو کئی اعتبار سے انفرادیت حاصل ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں کل 22 ابواب قائم کیے ہیں جن میں مختلف مفکرین کی آرا کے ذریعے تحقیق کی اقسام اور مقاصد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تحقیق، تنقید اور ترتیب کے اشتراک و اختلاف، موضوع کے انتخاب، محقق اور نگراں کے اوصاف، مقالے کی نوعیت، زبان و بیان کی صحت اور قطعیت، مقالے میں استعمال ہونے والے رموز و اوقاف، کتاب بندی اور فہرست سازی کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔

صفحات: 650، قیمت: -/170 روپے

وضاحتی کتابیات

مرتب: مظفر حنفی

پروفیسر مظفر حنفی نے قومی اردو کونسل کے ایک منصوبے کے تحت سال بہ سال شائع ہونے والی کتابوں کے تعارف اور مختصر تبصرے پر مبنی ''وضاحتی کتابیات'' کل 22 جلدوں میں مرتب کی ہے۔ ہر برس کی کتابوں کا ذکر الگ الگ جلدوں میں ہے۔ موصوف نے وضاحتی کتابیات کے متعینہ اصولوں پر کاربند رہتے ہوئے کم سے کم الفاظ میں متعلقہ کتاب کے بارے میں معروضیت کے ساتھ ضروری اطلاعات فراہم کردی ہیں، جن کے وسیلے سے محقق اور طالب علم مطلوبہ معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔

22 جلدوں کی مجموعی قیمت: -/2693 روپے

بیسویں صدی ... کے اردو مصنفین

مصنفہ: سنجیدہ خاتون

اس کتاب میں متعلقہ دور کے مصنفین کے ابتدائی حالات، تعلیمی مراحل اور مشاغلِ حیات کی تفصیلات فراہم کی گئی ہیں۔ قلم کاروں میں شعرا، ناول نگار، افسانہ نگار، ڈراما نگار، محققین، ناقدین، طنز و مزاح نگار اور صحافیوں کے علاوہ سوانح، تاریخ اور اسلامی لٹریچر کی نمائندہ شخصیات شامل ہیں۔ اردو میں سوانحی حوالوں کی کتابوں کی کمی کھلتی ہے، یہ کتاب اسی خلا کو پُر کرنے کی ایک کوشش ہے جو 147 ادبا کے مختصر تذکروں پر مبنی ہے۔

صفحات: 570، قیمت -/137 روپے

ایم مبین

انٹرنیٹ اور اردو

انسانی تہذیب کو اکیسویں صدی کی سب سے بڑی دین انفارمیشن ٹیکنالوجی ہے ایسا نہیں ہے کہ یہ اکیسویں صدی کی ایجاد ہو۔ بلکہ بیسویں صدی کے اواخر میں انسان نے اسے ڈھونڈھ لیا تھا اور اس کے استعمال کے لیے تجربے بھی شروع کردیے تھے۔ لیکن اکیسویں صدی کے اوائل میں یہ ایک انقلاب کی شکل اختیار کرگئی اور جیسا کہ سب جانتے ہیں انقلاب جب آتا ہے تو زندگی، تہذیب، سماج، تمدن ہر شعبے میں تبدیلی پیدا کردیتا ہے۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی بھی اکیسویں صدی کی ابتدا میں انسانی زندگی میں ایک انقلاب کی طرح نمودار ہوئی اور صرف آٹھ سالوں میں انسانی تہذیب وتمدن پر اس طرح اثرانداز ہوئی ہے کہ آج اس کے استعمال کے بنا انسان کو اپنی زندگی ادھوری محسوس ہونے لگی ہے۔

اس انقلاب نے سب سے اہم کام یہ کیا ہے کہ علم کی حدیں وسیع کردی ہیں دنیا میں دس بیس سال قبل تک جتنے بھی علوم تھے اور ان علوم کی جتنی معلومات کتابی شکل میں موجود تھی اس تکنیک کی وجہ سے دس سے بیس گنا زیادہ وسیع ہوگئی ہے۔ پہلے کسی کھوج، ایجاد سے عام آدمی کو استفادہ کرنے میں مہینوں یا سالوں لگ جاتے تھے۔ آجکل کچھ ہی پلوں میں اس تک ہر نئی دریافت پہنچ جاتی ہے۔ اس ٹیکنالوجی کی بدولت آج کا طالب علم دس بیس سال قبل کے طالب علموں سے 10 گنا زیادہ علم رکھتا ہے کیونکہ اس کے پاس علم حاصل کرنے کے تیز رفتار ذرائع ہیں۔

ابتدا میں انگریزی کے سوا دنیا کی دیگر زبانیں اس انقلاب کی صرف تماشائی تھیں۔ وہ حسرت سے اس انقلاب اور اس کی وجہ سے نمودار ہونے والی تبدیلیوں کو دیکھ رہی تھیں کیونکہ وہ کمپیوٹر سے آشنا نہیں تھیں اس ٹیکنالوجی سے وہی زبانیں فیض حاصل کرسکتی تھیں جو کمپیوٹر آشنا ہوں۔ اس بات کو دنیا کی دیگر زبانوں کے چاہنے والوں نے محسوس کیا اور انھوں نے اپنی زبان کو کمپیوٹر آشنا کرنے کی کوششیں کیں۔ ان میں سے ایک زبان اردو بھی ہے۔ انٹرنیٹ کے آغاز کے بعد اردو والوں کے دلوں میں بھی یہ خواہش پیدا ہوئی کہ انٹرنیٹ پر اردو زبان کا استعمال کیا جائے۔ لیکن وہ اس وقت اتنے ہی بے بس تھے جتنے دنیا کی دوسری زبانوں والے۔ کیونکہ بھلے ہی کمپیوٹر کی زبان صرف دو اشاروں 0 اور 2 پر بنی اشاروں کی زبان ہو لیکن ان اشاروں کو الفاظ میں تبدیل کرنے کا کام صرف انگریزی زبان سے ہی لیا جاتا تھا۔ اس طرح کمپیوٹر بھلے ہی دنیا کی ہر زبان کا استعمال کرنے کے قابل ہو لیکن وہ صرف انگریزی زبان ہی سے آشنا تھا۔ انگریزی زبان ہی سمجھتا تھا۔ اس میں اپنے جوابات دیتا تھا۔

تبھی اردو والوں نے بھی انٹرنیٹ پر اردو زبان کے استعمال کا آسان طریقہ ڈھونڈ نکالا۔ اردو کو انٹرنیٹ اور کمپیوٹر پر رومن رسم الخط میں لکھا جانے لگا۔ اس طرح اردو داں افراد کے درمیان اردو میں ترسیل کا مسئلہ ختم ہوگیا۔ اب وہ آسانی سے ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ کرکے نہ صرف اپنی بات ایک دوسرے تک پہنچا سکتے تھے بلکہ ایسے لوگوں تک بھی پہنچا سکتے تھے جو اردو رسم الخط سے ناواقف ہیں لیکن اردو سمجھ لیتے ہیں۔ اس طرح رومن رسم الخط میں پیغامات رسانی کے لیے ای میل کا استعمال ہونے لگا۔ کئی ویب سائٹ رومن رسم الخط میں شروع کی گئیں۔ لیکن اس سے اردو کیا کسی بھی زبان کے بولنے والے مطمئن نہیں تھے۔ ان کا رسم الخط ان کی زبانوں کی تہذیب تھی اور وہ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ پر اپنی زبان کو اپنے رسم الخط میں دیکھنا چاہتے تھے۔

آخر اس کا بھی آسان طریقہ نکل آیا اور مواد کو تصویروں کی شکل میں انٹرنیٹ پر پیش کیا جانے لگا۔ یعنی ہاتھ سے لکھ کر، ٹائپ کرکے یا پھر ڈی ٹی پی کروا کر اس مواد کی تصویر بنالی جاتی تھی اور اسے انٹرنیٹ پر ڈال دیا جاتا تھا۔ اس طرح زبانیں اپنے اصلی رسم الخط میں انٹرنیٹ پر پڑھی جانے لگیں اور اردو کے ساتھ ساتھ دنیا کی تمام زبانوں کے جاننے والوں نے انٹرنیٹ پر اپنی زبان کی ترسیل کے لیے اس طریقے کا استعمال کیا۔

ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ طریقہ کارگر اور تسلی بخش ہے اس کے بعد کسی اور طریقے کی تلاش کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اس پر بس نہ کرکے ''فونٹ'' بنانے کا کام شروع کیا گیا۔ ایسے فونٹ جن سے انٹرنیٹ اور کمپیوٹر پر لکھا جاسکے اس طرح تقریباً تمام ترقی یافتہ زبانیں ''فونٹ'' کی مدد سے انٹرنیٹ پر گئیں۔ تصویری تحریروں کی جو فائلیں بنائی جاتی تھیں وہ بہت بھاری بھرکم ہوتی تھیں اور ابتدائی سست رفتار انٹرنیٹ پر انھیں کھلنے میں کافی وقت لگتا تھا۔ ''فونٹ'' کی مدد سے تیار کی گئی فائل یا ویب سائٹ فوراً کھل جاتی تھی۔

لیکن ایک مسئلہ اور سامنے آگیا۔ جس کمپیوٹر سے اس ویب سائٹ کو دیکھا جارہا ہے، یا اس فونٹ میں لکھی فائل کھولی جارہی ہے اگر اس کمپیوٹر میں وہ فونٹ ہوں، تو ویب سائٹ یا فائل بہ سہولت کھل پاتی تھی۔ ورنہ اس کا ایک لفظ بھی پڑھنا مشکل ہوتا تھا اس کے لیے اس فونٹ کا اس کمپیوٹر میں انسٹال ہونا بے حد ضروری تھا اس لیے ہر ویب سائٹ اپنی ویب سائٹ پر استعمال کیے جانے والے فونٹ بھی مہیا کراتی تھی۔ تاکہ ویب سائٹ سے اچھی طرح استفادہ کرنے کے لیے اس کے قارئین اس فونٹ کو ڈاؤن لوڈ کرکے انسٹال کرلیں لیکن کچھ مدت بعد یہ بھی ایک اکتا دینے والا طریقہ محسوس ہوا۔ ہر ویب

سائٹ کے لیے قارئین کو اس ویب سائٹ کا فونٹ کمپیوٹر میں استعمال کرنا پڑتا تھا۔ اس کے بعد دنیا کے سب سے بڑے کمپیوٹر کے ادارے مائیکروسافٹ نے فونٹ ایمبیڈنگ کی تکنیک ایجاد کی۔ اس تکنیک کے تحت انٹرنیٹ پر دینے کے لیے جو فائل تیار کی جاتی تھی وہ جب ایمبیڈنگ کرنے کے بعد انٹرنیٹ پر ڈالی جاتی تھی تو دنیا کے کسی بھی کمپیوٹر میں اس فونٹ میں کھلتی تھی اس کے لیے فونٹ انسٹال کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اردو زبان میں بھی اس زمانے میں اس تکنیک کے کئی فونٹ اور سافٹ ویئر بنائے گئے ان میں سب سے زیادہ موثر پارس نگار، نامی سافٹ ویئر ثابت ہوا۔ جو بیک وقت اردو، فارسی اور عربی زبانوں کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس سافٹ ویئر کے فونٹ کے لیے خط نسخ کا استعمال کیا گیا۔۔۔ اس سافٹ ویئر کی مدد سے نہ صرف آسانی سے اردو زبان میں ویب صفحات بنائے جاتے تھے بلکہ اس فونٹ کو کمپیوٹر میں انسٹال کرلینے کے بعد آسانی سے یہ انٹرنیٹ پر کھل بھی جاتے تھے۔ اور فونٹ ایمبیڈنگ تکنیک سے تو دنیا کے کسی بھی کمپیوٹر میں ان صفحات کو اپنی اصلی حالت متن کے ساتھ کھلنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی۔

اس تکنیک کے تحت سینکڑوں ویب سائٹ شروع ہوئیں جو آج بھی انٹرنیٹ پر موجود ہیں۔ اردو کی سب سے اہم ویب سائٹ www.urdunet.com آج بھی اس سافٹ ویئر، فونٹ اور تکنیک کا استعمال کررہی ہے اور اس ویب سائٹ پر اردو زبان و ادب کے اب تک ہزاروں صفحات موجود ہیں۔ پاکستان کی کئی ویب سائٹ نے ویب صفحات کی تیاری میں اس سافٹ ویئر کا استعمال کیا لیکن بعد میں انھوں نے ان صفحات کے متن کو تصویروں کی شکل میں ویب سائٹ پر ڈال دیا۔ کیونکہ اس دوران Gif تصویری فائل کوئی ترقی یافتہ شکل اختیار کرگئی تھی اور اس زمرے میں تیار کی گئی فائل کا ''وزن'' نہ صرف کافی کم ہوتا تھا بلکہ رنگوں میں شفافیت ہونے کی وجہ سے قارئین کو پڑھنے میں آسانی ہوتی تھی اور ویب صفحات کافی خوبصورت، جاذب نظر لگتے تھے۔ اردو کے مشہور سافٹ ویئر، ان پیج، میں مواد کی Gif فائل بنانے کی سہولت ابتدا سے موجود تھی۔ اس لیے اردو کی زیادہ تر ویب سائٹ inpage میں Gif فائل میں تیار کی گئیں اور آج بھی اردو ویب ڈیزائنر اس طریقے کو پسند کرتے ہیں۔ کیونکہ Gif میں فائلیں وزنی نہیں بنتی ہیں اس لیے انھیں انٹرنیٹ پر کھولنے میں کوئی پریشانی پیش نہیں آتی نہ وقت لگتا ہے۔

لیکن اتنی موثر تکنیکیں آجانے کے بعد بھی اس پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ بلکہ جستجو یہ رہی کہ دنیا کے ہر کمپیوٹر میں دنیا کی ہر ترقی یافتہ زبان لکھی جاتی آسان ہو۔ اور دنیا کے ہر کمپیوٹر میں دنیا کی کسی بھی زبان کی ویب سائٹ آسانی سے کھل جائے اور پڑھی جاسکے۔

اس کے لیے یونی کوڈ تکنیک اپنائی گئی۔ اس تکنیک نے انٹرنیٹ کی دنیا میں انقلاب برپا کردیا اور دنیا کی تمام زبانیں جو انٹرنیٹ اور کمپیوٹر آشنا ہونے کے لیے مسائل سے دوچار تھیں اس تکنیک کے آنے کے بعد ان کے سارے مسائل دور ہوگئے۔

اب دنیا کے کسی بھی کمپیوٹر میں نہ صرف دنیا کی کوئی بھی زبان لکھی جاسکتی ہے بلکہ اس کے ویب صفحات آسانی سے اس کمپیوٹر میں کھل سکتے ہیں اور تیار بھی کیے جاسکتے ہیں مائیکروسافٹ نے اپنے ونڈوز کے 2000 کے ورژن میں اس تکنیک کو محفوظ رکھا۔ اور ونڈوز کے اس ورژن میں انھوں نے ایسے فونٹ تیار کرکے ڈالے جن سے یونی کوڈ زبان میں تیار کیے گئے کسی بھی زبان کے صفحات اور فائل آسانی سے کھل جائیں۔ انھوں نے ونڈوز کے ساتھ Tohama, Arile, New Times Roman, Son Shavit جیسے ایسے کئی فونٹ دیے جن میں یونی کوڈ کی سہولت موجود تھی۔ ونڈوز کے ورژن 200، ونڈوز ایکس پی اور ونڈوز وسٹا اردو زبان کے لیے بہت روشن امکانات لے کر آئے ہیں۔ ان ورژن میں اردو زبان کے لیے مائیکروسافٹ نے اتنی سہولتیں بہم پہنچائی ہیں جو دنیا کی کسی بھی ترقی یافتہ زبان کے مساوی ہیں۔ بشرطیکہ ان سہولتوں کا استعمال کرنے والے افراد ہمارے پاس موجود ہوں۔ ونڈوز کے ان ورژن میں یہ سہولت حاصل ہے کہ بنا کسی سافٹ ویئر کے ونڈوز کے کسی بھی پروگرام میں آپ اردو لکھ سکتے ہیں۔ وہ چاہے ایم ایس آفس کا ورڈ، ایکسل، پاور پوائنٹ ہو یا کورل 12، یا کوئی اور سافٹ ویئر یا پھر نوٹ پیڈ، پہلے کمپیوٹر میں اردو لکھنے کے لیے ان پیج جیسے مہنگے سافٹ ویئر کی ضرورت پڑتی تھی۔ لیکن آج جو کام ان پیج میں ہوتا تھا وہی کام مفت دستیاب ہونے والے جاوا اسکرپٹ میں تیار کیے گئے سافٹ ویئر میں آسانی سے کیا جاسکتا ہے اوراب تو یونی کوڈ میں بھی خط نسخ پر منحصر رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کئی نستعلیق کے فونٹ بھی بنائے جاچکے ہیں۔ جن میں ان پیج میں تیار کیے گئے مواد کی سی خوبصورتی موجود ہوتی ہے۔

اب اردو زبان میں انٹرنیٹ پر ای میل لکھنا، روانہ کرنا، کمیونٹی سائٹس میں پیغامات لکھنا اور بلاگس میں اردو زبان میں آن لائن بلاگ لکھنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ آج یہ ساری سہولتیں دنیا کی سینکڑوں زبانوں کو حاصل نہیں ہے لیکن اردو زبان کو حاصل ہیں۔ اس کی وجہ سے انٹرنیٹ پر اردو زبان کا استعمال بڑھ رہا ہے اور روزانہ اردو کی نئی ویب سائٹ بلاگ انٹرنیٹ کی دنیا میں وجود میں آرہی ہیں۔ اردو زبان کا امتیاز یہ ہے کہ اردو کا یہ سارا کام انٹرنیٹ پر بنا کسی سرکاری یا کارپوریٹ سرپرستی کے ہورہے اور ہورہا ہے۔ اگر اسے سرکاری یا کارپوریٹ سرپرستی مل جائے تو یہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے مقابل کھڑی ہوجائے گی۔

□□□

مدحت لقمان

بجلی (Electricity)

اس مضمون کا مقصد یہ ہے کہ غیر ٹیکنکل حضرات کے لیے بجلی کے متعلق کچھ معلومات فراہم کرائی جائیں۔ اس کو ایک ٹکسٹ (Text) کا درجہ نہیں دیا جانا چاہیے۔ مضمون نگار نے اپنی معلومات اور تجربے کو بنیاد بنا کر یہ مضمون لکھا ہے۔

ایک وقت تھا کہ آسمان میں چمکنے والی بجلی اور بادلوں کی گرج سے انسان خوف زدہ یا خوش ہوا کرتا تھا۔ سائنس دانوں کے لیے یہ ایک تحقیق طلب معاملہ تھا۔ غالباً اسی طلب کے نتیجے میں 1752 کے لگ بھگ بنجامن فرینکلن (Benjamin Franklin) نے گرجتے ہوئے بادلوں کی موجودگی میں پتنگ اڑائی اور ہاتھ کے پاس ڈور میں چابی باندھی۔ اس نے پایا کہ چابی کو چھونے سے جھٹکا محسوس ہوتا ہے۔ اس تجربے سے اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ بادلوں میں چمک ان میں بجلی پیدا ہونے سے ہوتی ہے، جسے ہم آج الیکٹرو اسٹیٹک چارج (Electro Static Charge) کہتے ہیں۔

1780 کے قریب بجلی پیدا کرنے پر کئی سائنس دانوں نے کام کیا تھا۔ جن میں سرمائکل فیریڈے (Sir Michael Faraday) اور الیکزنڈر وولٹا (Alexandr Volta) خصوصیت رکھتے ہیں۔ مختلف دھاتوں اور کیمیائی اشیا کا استعمال کر کے وولٹا نے بجلی پیدا کی جو استعمال کے لائق بجلی کی شروعات تھی۔ سرمائکل فریڈے نے یہ پتہ لگایا کہ اگر دھات کے تار میں بجلی گزاری جائے تو تار کے چاروں طرف مقناطیسی ماحول (Magnetic Field) پیدا ہو جاتا ہے۔

اگر دھات کے تاروں کو چمبکوں (Magnets) کے درمیان جنبش دی جائے تو تار یا تار کے گچھے (Coil) میں بجلی پیدا ہوتی ہے۔ بس یہیں سے بیٹریوں کے بغیر بجلی حاصل کرنے کی بنیاد پڑی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا مختلف جگہوں پر سائنس دانوں اور ٹیکنالوجسٹس (Technologists) نے وہ طریقے اور مشینیں ایجاد کر لیں جن کے ذریعے بجلی کو ایک بڑی طاقت بنا کر کام میں لانے کی صلاحیت پر عبور حاصل ہو گیا۔

بجلی پیدا کرنے کے تین خاص طریقے ہیں:

☆ بیٹریوں کے ذریعے۔ ان میں لیڈ ایسڈ (Lead Acid)، لیک لانچی (Laclaunchi)، نکل کیڈمیم، لیتھیم وغیرہ بیٹریاں شامل ہیں۔

☆ سورج کی روشنی سے، یعنی سولر سیل (Solar Cells) کے ذریعے۔

☆ ڈائنمو (Dynamo) یا آلٹرانیٹر (Alternator) کے ذریعے۔

کچھ بیٹریوں میں دھاتوں اور کیمیائی اشیا (Chemical) کا استعمال ہوتا ہے۔ جیسے لیڈ ایسڈ اور لیک لانچی۔ کچھ میں مختلف دھاتوں کو ایک خاص طریقے سے استعمال کر کے۔ جیسے نکل کیڈمیم، لیتھیم وغیرہ بیٹریاں جن کو چارج کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

سولر سیلس (Sollar Cells) کے ذریعے سورج کی روشنی براہِ راست بجلی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ان بیٹریوں میں ایک طرف بہنے والی بجلی ہوتی ہے۔ یعنی ان میں ایک ٹرمنل (Terminal) پازیٹو (+ve) ہوتا ہے اور دوسرا نیگیٹو (-ve)۔ بجلی (الیکٹران کی روانی) نیگیٹو سے پازیٹو کی طرف بہتی ہے جب کوئی لوڈ (کوئی آلہ جس میں بجلی صرف ہوتی ہو جیسے بلب) دونوں ٹرمنلوں سے جوڑا جاتا ہے۔

ڈائنمو اور آلٹرنیٹر دونوں ایسی مشینیں ہیں جو گھمائے جانے پر ہی بجلی پیدا کرتی ہیں۔ سائیکل کا ڈائنمو (اصلیت میں یہ ایک آلٹرنیٹر ہوتا ہے مگر عام طور پر ڈائنمو ہی کہا جاتا ہے) تبھی بجلی دیتا ہے، جب پہیے سے چپک کر گھومتا ہے۔ کار کے انجن میں لگا ہوا ڈائنمو (بیٹری چارج کرنے کے لیے) اسی وقت بجلی دیتا ہے جب انجن چل رہا ہو (گھوم رہا ہو)۔ ڈائنمو DC دیتا ہے چونکہ بیٹری چارج کرنے کے لیے DC درکار ہوتی ہے۔ آجکل موٹروں (Motor Cars) میں ڈائنمو کی جگہ آلٹرنیٹر بھی استعمال کیے جاتے ہیں اور ان میں سے نکلتے ہوئے آلٹرنیٹنگ کرنٹ (AC) کو الیکٹرانک سرکٹ کے ذریعے DC میں تبدیل کر لیا جاتا ہے۔

اسپنڈل پر لگا ہوا مقناطیس (Magnet) جس کا ایک پول (خم دار سرا) ساؤتھ (S) ہے اور دوسرا نارتھ (N) ہے تیزی سے گھمایا جا سکتا ہے۔ فیلڈ کوائل کے سامنے آتے ہوئے پولس (Poles) مسلسل تیزی سے بدلتے رہیں گے یعنی S-N-S-N..... اس مسلسل عمل سے فیلڈ کوائل میں پیدا ہونے والی بجلی AC (Alternating Current) کہلاتی ہے۔ (کوائل اور میگنیٹک فیلڈ میں اگر ایک دوسرے کے مقابلے میں جنبش نہیں ہے تو بجلی نہیں بنے گی)۔

بجلی سے متعلق جو اصطلاحیں عام طور پر استعمال میں آتی ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

☆ وولٹیج۔ اسے انگریزی سے حرف V سے ظاہر کیا جاتا ہے

☆ ای ایم ایف۔ اسے انگریزی حروف emf سے ظاہر کیا جاتا ہے جس کا مطلب ہوتا ہے الیکٹرو موٹو فورس (Electromotive)

☆ امپیئر (Ampere) اسے انگریزی حرف I سے ظاہر کیا جاتا ہے۔
امپیئر کو مختصر Ampi بھی لکھ دیتے ہیں

☆ واٹ (Watt)۔ اسے انگریزی حرف w سے ظاہر کیا جاتا ہے

☆ ریزسٹینس (Resistances) اسے انگریزی حرف R سے ظاہر کیا جاتا ہے

☆ کپیسٹنس (Capacitance) اسے انگریزی حروف Cp سے ظاہر کیا جاتا ہے۔

☆ کنڈکٹر (Conductor)

☆ فری کوئنسی (Frequencey)۔ اسے انگریزی حرف F سے ظاہر کیا جاتا ہے۔

☆ پاور فیکٹر (Power Factor)۔ اسے ریاضی کی اصطلاح Cosp سے ظاہر کیا جاتا ہے

☆ کلوواٹ آور۔ اسے انگریزی حرف KWH سے ظاہر کیا جاتا ہے

بڑے پیمانے پر اے سی بجلی کی پیداوار

بڑے پیمانے پر بجلی کی پیداوار سے مراد ہے کلوواٹ امپیئر (KVA) یا میگاوولٹ امپیئر MVA میں بجلی پیدا کرنا۔ یہ پیداوار بڑے بڑے پاور اسٹیشنوں میں کی جاتی ہے جہاں بڑے آلٹرنیٹر ٹربائن (Turbines) کے ذریعے گھمائے جاتے ہیں۔ ٹربائن وہ مشین ہے جو پانی، بھاپ یا گیس کے زور سے تیزی سے گھومتی ہے اور اپنے ساتھ جڑے آلٹرنیٹر کو گھماتی ہے۔

وہ جگہیں جہاں باندھ بنا کر پانی کے زور سے ٹربائن چلائے جاتے ہیں، ہائیڈرو پاور اسٹیشن کہلاتے ہیں۔ جہاں بھاپ پیدا کر کے ٹربائن چلائے جاتے ہیں انھیں تھرمل پاور اسٹیشن کہتے ہیں۔ نیوکلیئر پاور اسٹیشن میں نیوکلیئر فیوژن سے پیدا ہونے والی گرمی سے بھاپ بنا کر ٹربائن چلائے جاتے ہیں۔

زیادہ تر پاور ہاؤسوں میں جو آلٹرنیٹر لگے ہوتے ہیں وہ تین فیز (3-Phase) میں بجلی بناتے ہیں۔ آلٹرنیٹروں کی بناوٹ ایسی ہوتی ہے جس سے تینوں فیز ایک دوسرے سے 120° وولٹیج دیتے ہیں۔

پاور ہاؤسوں میں پیدا ہونے والی تین فیز کی بجلی عام طور پر 800kv یا اس سے زیادہ ہوتی ہے۔

ٹرانسفارمر بجلی کا وہ آلہ ہے جس کے ذریعے AC وولٹیج کو کم یا زیادہ کیا جاسکتا ہے۔ مگر پاور قریب قریب ایک ہی رکھی جاسکتی ہے۔ ٹرانسفارمر میں تار کی دو الگ الگ لپیٹیں (windings) ہوتی ہیں۔ جس وائنڈنگ کو سپلائی سے جوڑا جاتا ہے اسے پرائمری وائنڈنگ اور جس سے بجلی لی جاتی ہے اسے سیکنڈری وائنڈنگ کہتے ہیں:

مثال کے طور پر پرائمری وائنڈنگ کے کوائل میں 100 چکر (Turns) اور سیکنڈری میں 25 چکر ہیں تو ٹرانس فارمیشن تناسب (Ratio) 1:4 ہوا۔ اگر پرائمری وولٹیج 220 ہے تو سیکنڈری کا وولٹیج قریب 55 ہوگا۔ قریب اس لیے کہا گیا ہے چونکہ ٹرانس فارمیشن کے دوران کچھ کمی آجاتی ہے۔

ٹرانسفارمر ایک فیز کے لیے اور تین فیز کے لیے بھی ہوتے ہیں۔ چھوٹے ٹرانسفارمر کی طاقت (Rating) وولٹیج اور امپیئر میں ظاہر کی جاتی ہے۔ بڑے الیکٹرک سپلائی سب اسٹیشنوں پر یا بڑے کارخانوں میں استعمال کیے جانے والے ٹرانسفارمر 800kv' 220' 132kv یا 33kv وغیرہ کے ہوتے ہیں۔

ٹرانسمیشن: بجلی ایک جگہ سے دوسری جگہ کئی کئی کلومیٹر لمبے تاروں کے ذریعے پہنچائی جاتی ہے۔ ان تاروں میں رکاوٹ (Resistance) ہونے کی وجہ سے کچھ پاور ضائع ہو جاتی ہے۔ پاور بانٹنے کا نظام ایسے ڈیزائن کیا جاتا ہے کہ کم سے کم نقصان ہو۔ اس کے لیے پاور کو بہت زیادہ وولٹیج پر بانٹا جاتا ہے۔ پاور ہاؤسوں میں بھی خود کا سب اسٹیشن ہوتا ہے جہاں آلٹرنیٹروں سے پیدا ہونے والی پاور (عام طور پر 6.6kv سے 11kv تک ہوسکتی ہے) کو سب اسٹیشن میں ٹرانسفارمر کے ذریعے وولٹیج بڑھا کر 220kv'800kv وغیرہ والی لائنوں پر بانٹ دیا جاتا ہے۔ تینوں فیز پر لوڈ برابر رکھنے کا انتظام رہتا ہے۔ دور دراز جگہوں پر موجود سب اسٹیشن اس پاور کو اپنی طرف لے لیتا ہے اور ٹرانسفارمروں کے ذریعے وولٹیج کم کر کے یعنی 11kv وغیرہ پر لاکر گروپ ڈسٹری بیوشن پوائنٹ پر پہنچایا جاتا ہے۔ وہاں سے 0.4kv میں تبدیل کر کے کنزیومرس کو دی جاتی ہے۔ کارخانوں، آٹا چکیوں، کار سروس اسٹیشنوں، پمپ ہاؤسوں وغیرہ میں 3-Phase, 440 Volts, 50Hz۔ اسی سے ان جگہوں میں استعمال ہونے والے تین فیز کے موٹر چلائے جاتے ہیں۔

گھروں، دفتروں و بازاروں میں عام طور پر I.Phase, 220volts, 50Hz کا استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے طے کیے ہوئے حلقوں میں ٹرانسفارمر لگے رہتے ہیں۔ یہاں پر یہ ذکر کرنا مناسب ہے کہ بڑے کارخانوں کے احاطوں میں بجلی محکمے کی زیر نگرانی ایک پاور سپلائی اسٹیشن ہوتا ہے اور اسی جگہ 11kv کو کم کر کے 440 وولٹس کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں خاص قسم کے کیپاسٹرس (Capacitor) لگے رہتے ہیں جو کہ کارخانے کے انڈکٹیو لوڈ (Inductive Load) کی وجہ سے پاور فیکٹر (Cos) کو بہتر رکھنے میں مددگار ہوتے ہیں۔ اس طرح الیکٹریکل انرجی بہتر طریقے سے استعمال میں آتی ہے اور بجلی کا بل بلا وجہ بڑھتا نہیں ہے۔

گھروں اور دفتروں میں پنکھے یا چھوٹے موٹر 1-Phase, 220v, 50Hz سے ہی چلتے ہیں پنکھوں اور موٹروں کے اندر کی وائنڈنگ ایک خاص

طریقے سے ہوتی ہے اور کیپا سٹرس کا استعمال کرکے انھیں چلنے کے لائق بنایا جاتا ہے۔

احتیاطی تدابیر: گھروں، کارخانوں، پمپ ہاؤس وغیرہ میں ارتھ تار کا استعمال بہت ضروری ہے۔ اس کی موجودگی سے شدید جھٹکا لگنے کے امکان کم ہوجاتے ہیں۔ راستے میں یا کسی اور جگہ بجلی کے گرے ہوئے تار سے بچ کر نکلنا چاہیے اور اس کی اطلاع بجلی گھر کو دے دینا چاہیے۔ غسل خانے میں گیلے ہاتھ سے بجلی کے بٹن کو چھونا خطرناک ہوسکتا ہے۔ اس لیے بہت احتیاط برتنی چاہیے۔ گھر یا دفتر میں ہوائی وائرنگ آپس میں چپک جانے سے (Short Circuit) آگ لگ جانے کا خطرہ رہتا ہے۔ یہی صورت بجلی سے کام کرنے والے سامان کی خرابی سے بھی ہوسکتی ہے۔ ان اسباب سے ہونے والے نقصانات سے بچنے کے لیے ایم سی بی (Master Circuit Breaker) کا لگوانا بہتر ہے۔ ایسے آلات بھی لگوائے جاسکتے ہیں جن سے بجلی کی سپلائی فوراً بند ہوجاتی ہے۔ اس طرح شدید نقصان سے بچا جاسکتا ہے۔ گھروں میں میٹر کے پاس مین سوئچ بھی لگا رہتا ہے جس میں فیوز کٹ آؤٹ لگے رہتے ہیں۔ ان میں اتنے ہی امپئر کا فیوز تار لگانا چاہیے جتنے لوڈ کی اجازت ہے اور وائرنگ بھی اسی طرح کی جانی چاہیے۔ زیادہ موٹا تار لگانے سے شارٹ سرکٹ ہونے پر تار فیوز ہونے میں دیر لگ سکتی ہے جو کہ نقصان کا باعث ہوسکتی ہے۔ جہاں گیس یا آتش گیر سیال مادے ہوتے ہیں، اس جگہ بجلی کی چنگاری (Spark) نہیں پیدا ہونا چاہیے۔ بجلی کی وجہ سے اگر کہیں آگ لگ جائے تو سب سے پہلے بجلی کو مین سوئچ سے بند (Off) کردینا چاہیے۔ اس کے بعد اگر ضروری ہے تو آگ بجھانے کے لیے پانی کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ بہتر تو یہی ہے کہ آگ بجھانے والا آلہ (Fire Extinguisher) کا استعمال کیا جائے۔

□□□

پتہ:
EWS 109/4 ADA
Colony, Neem Sarai
Allahabad-211011

کلیات راجندر سنگھ بیدی —

مرتب: وارث علوی

کلیات راجندر سنگھ بیدی کی پہلی جلد میں افسانے اور دوسری جلد میں بیدی کے ناولٹ، ڈرامے، مضامین، انشائیے، خاکے، خطبے، دوسروں کی کتابوں پر لکھے گئے دیباچے، تبصرے، تاثرات، تنقیدیں اور مختلف ادبی شخصیات کو لکھے گئے 31 خطوط ہیں۔ جلد اول میں مرتب نے راجندر سنگھ بیدی کی زندگی اور شخصیت کے علاوہ بیدی کے افسانوں کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔ اس کے بعد ان کے افسانوں کے ساتوں مجموعے — دانہ و دام، گرہن، کوکھ جلی، اپنے دکھ مجھے دے دو، ہاتھ ہمارے قلم ہوئے، مکتی بودھ اور اس کے علاوہ بیدی کے وہ افسانے بھی شامل ہیں جو ان کے کسی مجموعے میں نہیں ہیں۔ دوسری جلد میں ان کے ناولٹ 'ایک چادر میلی سی' اور ان کے ڈراموں کے دونوں مجموعے — بے جان چیزیں اور سات کھیل جن میں گیارہ ڈرامے ہیں۔ اس دوسری جلد میں بیدی کے فن پر وارث علوی کا مضمون ان کے فن کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

جلد اول: صفحات : 1040، قیمت : -/525 روپے / جلد دوم: صفحات : 655 قیمت : -/380 روپے

دکنی لغت

مرتبہ: سیّدہ جعفر

دکنی شعر و ادب کی تفہیم، ہماری ادب فہمی کا ایک اہم پہلو ہے۔ پروفیسر سیّدہ جعفر نے، جو اردو زبان و ادب کی تاریخ پر عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ دکنیات کا بھی پاکیزہ ذوق رکھتی ہیں، اس لغت کی تدوین و ترتیب میں دکنی الفاظ، محاورات، ضرب الامثال، روزمرہ، تکیہ کلام اور ان کے معانی کی مختلف جہات کا احاطہ کیا ہے۔ ساڑھے پانچ سو برس قدیم ان دکنی الفاظ کا صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنا اس لیے ناگزیر ہے کہ زیر اور زبر سے معنی میں بہت تبدیلی آجاتی ہے۔ طلبہ و اساتذہ کی اسی ضرورت اور سہولت کے پیش نظر قومی اردو کونسل نے حال ہی میں یہ لغت شائع کی ہے۔

صفحات — 521، قیمت — 590 روپے

چودھری نوازش مہدی

بیرونی ممالک میں تعلیم

ہر طالب علم اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ایک بڑا آدمی بننے کے خواب دیکھتا ہے اگرچہ بہت کم طالب علم ہی اپنے اس خوبصورت خواب کو شرمندۂ تعبیر کر پاتے ہیں۔ بیشتر طالب علم عدم معلومات کے سبب آگے نہیں بڑھ پاتے۔ بیرونی ممالک میں تعلیم حاصل کرنا بھی اسی خواب کا حصہ ہے، کیونکہ وہاں تعلیم حاصل کر کے مستقبل کو روشن و تابناک بنانے کے امکانات زیادہ قوی ہو جاتے ہیں۔ ان ممالک میں بھی امریکہ، برطانیہ، کناڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ فرانس اور جرمنی وغیرہ ممالک کا نام خاص طور پر لیا جا سکتا ہے۔ تو آیئے ہم آپ کو کچھ ایسی معلومات فراہم کراتے ہیں، جو آپ کے لیے معاون و مددگار ثابت ہوں گی۔

بیرونی ممالک میں گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن دونوں سطحوں پر تعلیم دی جاتی ہے۔ ان میں آپ میڈیکل، قانون اور مینجمنٹ وغیرہ کی تعلیم بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ پہلی ضرورت یہ ہے کہ آپ کا تعلیمی ریکارڈ شاندار ہو۔ اگر آپ پوسٹ گریجویشن کی ڈگری حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آپ کا بیک گراؤنڈ مطلوبہ مضمون میں ہی ہونا چاہیے۔ بعد ازاں ہر کورس کے لیے کچھ کوالیفائنگ امتحانات ہوتے ہیں، جنھیں پاس کرنے کے بعد ہی آپ کو داخلہ ملے گا۔

ٹسٹ آف انگلش ایز فارن لینگویج (ٹی او ای ایف ایل)

تقریباً تمام ممالک کی یونیورسٹیوں میں داخلے کے لیے انگریزی زبان پر گرفت لازمی ہے اس سے متعلق داخلہ امتحان پاس کرنا پڑتا ہے۔ اس کے بغیر درخواست فارم پر غور بھی نہیں کیا جاتا۔ ٹسٹ میں امریکہ اور برطانیہ وغیرہ میں بولی جانے والی انگریزی زبان کا تجزیہ کیا جاتا ہے نیز امیدوار کی انگریزی لکھنے، بولنے اور سن کر سمجھنے کی صلاحیت کی بھی جانچ پرکھ کی جاتی ہے۔ اس ٹسٹ میں کل چار حصے ہوتے ہیں۔ الگ الگ حصے میں انگریزی زبان کو سمجھنے کی لیاقت، انگریزی گرامر کا علم، پڑھنے کی صلاحیت اور تحریر وغیرہ کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ 667 نمبروں کے اس امتحان میں کم سے کم 500 نمبر حاصل کرنے کے بعد ہی داخلہ ممکن ہو سکتا ہے۔ پوسٹ گریجویشن اور تحقیقی کاموں کے لیے تو 550 نمبروں تک کا اسکور حاصل کرنا پڑتا ہے۔ اس ٹسٹ کے فارم اور پروسپیکٹس کرنے اور زیادہ جانکاری کے لیے مندرجہ ذیل پتوں پر رابطہ کریں۔

☆ ڈائریکٹ انسٹی ٹیوٹ آف سائیکولوجیکل اینڈ ایجوکیشن میجر منٹ 119/25، اے مہاتما گاندھی روڈ، سول لائنس الہ آباد۔ 211001

☆ یونائیٹڈ اسٹیٹس ایجوکیشن فاؤنڈیشن ان انڈیا (فل برائٹ ہاؤس) 12، ہولی روڈ، نئی دہلی۔ 110001، فون 011-23328944

☆ یو ایس یو ایس اے، کنسولیٹ، چنئی۔ 600006

☆ یو ایس ای ایف آئی-38 اے، جواہر لال نہرو، کولکاتا-700071

ٹسٹ آف ریٹن انگلش (ٹی ڈبلیو ای)

عموماً یہ امتحان ٹی او ای ایف ایل کے ساتھ ہی منعقد کیا جاتا ہے، لیکن اس کے نمبر ٹی او ای ایف ایل کے ساتھ نہیں جوڑے جاتے۔ جو طالب علم ٹی او ای ایف ایل میں شامل ہوتے ہیں وہی اس امتحان میں بیٹھ سکتے ہیں۔ امتحان کا مقررہ وقت نصف گھنٹہ ہے۔ اس امتحان کے ذریعے انگلش لکھنے کی جانچ کی جاتی ہے۔ امتحان کے بارے میں تفصیلی جانکاری کے لیے مندرجہ ذیل پتہ پر رابطہ کریں۔

☆ دی برٹش کاؤنسل، برٹش ہائی کمیشن-17 کستوربا گاندھی روڈ، نئی دہلی

انٹر نیشنل انگلش لینگویج ٹسٹ (آئی ای ایل ٹی)

انگریزی زبان سے متعلق اس ٹسٹ کی شروعات آئی ڈی پی ایجوکیشن آسٹریلیا، برٹش کاؤنسل اور یونیورسٹی آف کیمبرج نے مل کر 3 سال قبل شروع کی تھی اور اس امتحان کی مکمل کارروائی کا نظم و نسق لنڈی ہائم کو دیا گیا۔ اس امتحان کو تقریباً 35 ممالک سے منظوری ملی ہے۔ اس امتحان کے ذریعہ انگریزی زبان کی جانچ کی جاتی ہے، عموماً تمام یونیورسٹیوں میں تعلیم کے لیے اس امتحان کا انعقاد ہندوستان کے 4 بڑے شہروں دہلی، ممبئی، کولکاتہ اور چنئی میں کیا جاتا ہے۔ یہ امتحان ہر ماہ دو بار منعقد کیا جاتا ہے، لیکن ایک امیدوار سال میں دو بار سے زیادہ اس امتحان میں نہیں بیٹھ سکتا۔ آئی آئی ایف ٹی کے ایک ماہر کے مطابق اس امتحان میں بیٹھنے کے لیے آن لائن ٹسٹ رجسٹریشن کرانا لازمی ہے۔ زیادہ جانکاری کے لیے مندرجہ ذیل پتے پر رابطہ کریں۔

☆ آئی ڈی پی ایجوکیشن آسٹریلیا، نہرو پلیس، نئی دہلی
برٹش کاؤنسل، کستوربا گاندھی روڈ، نئی دہلی

گریجویشن ریکارڈ ایگزامنیشن ٹسٹ (جی آر ای ٹی)

آرٹ سائنس اور انجینئرنگ کے ماسٹر ڈگری کورس اور ڈاکٹریٹ سطح کے کورسیز میں داخلہ کے لیے جی آر ای ٹسٹ لازمی ہے۔ 3 حصوں میں منقسم اس امتحان میں امیدوار کے زبان کے علم، منطقی صلاحیت اور ریاضی سے متعلق دلچسپی کا محاسبہ کیا جاتا ہے۔ داخلے کے لیے جی آر ای ٹی کی میعاد 5 سال تک ہوتی ہے۔ یعنی آپ امتحان پاس کرنے کے 5 سال بعد تک داخلہ لے سکتے ہیں۔ امتحان کی فیس 150 امریکی ڈالر ہے۔ اس امتحان کی تیاری کے لیے ایک

کمپیوٹر سافٹ ویئر بھی ڈیولپ کیا گیا ہے۔ "جی آر ای پاور پریپ" نام کے اس سافٹ ویئر میں نمونے کے پیپر اور مضمون وغیرہ خوش خط میں لکھنے پر مبنی ٹپس دستیاب ہیں۔ یونائیٹڈ اسٹیٹس ایجوکیشن فاؤنڈیشن ان انڈیا-12 ہولی روڈ، نئی دہلی 110001 میں اس ٹسٹ کے لیے تیاری کرنے کا بھی خصوصی انتظام ہے، جس کا فائدہ طالب علم متعینہ فیس ادا کرنے کے بعد اٹھا سکتے ہیں۔ تفصیلی جانکاری کے لیے یو ایس ای ایف آئی کے فون 011-23328944 پر کریئر کاؤنسل سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ جی آر ای امتحان میں رجسٹریشن کے لیے مندرجہ ذیل پتے پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں۔

☆ سلور ٹسٹنگ سروسیز پرائیویٹ لمیٹیڈ سینٹر پلازا 160 اے گوتم نگر، یوسف سرائے بھائنڈ انڈین آئل بلڈنگ، نئی دہلی -110049، فون 011-2051164

گریجویٹ مینجمنٹ ایجوکیشن ٹسٹ (جی میٹ)

مینجمنٹ سے متعلق کورسیز میں داخلے کے لیے جی میٹ امتحان کا انعقاد ہر سال 4 بار کیا جاتا ہے۔ اس میں طالب علموں کی مینجمنٹ سے متعلق دلچسپی، ریاضی سے متعلق جانکاری اور مسائل کو حل کرنے سے متعلق صلاحیت کو پرکھا جاتا ہے۔ اس کی تیاری کے لیے بھی کئی کوچنگ ادارے وجود میں آچکے ہیں جن میں داخلے کے لیے کامیاب طالب علموں سے تبادلۂ خیال کرنا ضروری ہے۔ زیادہ جانکاری کے لیے مندرجہ ذیل پتے پر رابطہ کریں۔

☆ گریجویٹ مینجمنٹ ایڈمیشن ٹسٹ، ایجوکیشنل ٹسٹنگ سروس پی او باکس ،جی-103 پرنسٹن، نیوجرسی-085416103 یو ایس اے۔

ٹسٹ آف اسپیکنگ انگلش (ٹی ایس ای)

جو طالب علم پڑھائی کے دوران غیر ممالک سے اسکالرشپ حاصل کرنا چاہتے ہیں، ان کے لیے اس امتحان میں بیٹھنا لازمی ہے۔ یہ ٹسٹ بھی ٹی او ایف ای ایل کے ساتھ ہی اسی دن ہوتا ہے، لیکن ٹی او ای ایف ایل میں اس کے نمبر جوڑے نہیں جاتے ہیں۔ اس امتحان کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ٹی ایس ای اے ریسرچ اسکالر کے لیے اور ٹی ایس ای پی پروفیشنل کورسیز میں سرٹیفکیٹ کے لیے اس امتحان میں بھی انگریزی کا علم پرکھا جاتا ہے۔ خاص کر انگریزی بولنے کی صلاحیت کی جانچ کی جاتی ہے۔

اسکالیسٹک اسیس میٹ ٹسٹ (ایس اے ٹی)

ترقی یافتہ ممالک میں پڑھائی کے لیے ایس اے ٹی امتحان بھی انتہائی اہم ہے۔ ایس اے ٹی (سیٹ) امتحان کی مقررہ مدت 3 گھنٹے ہے۔ اس امتحان کا مقصد زبان اور ریاضی سے متعلق لیاقت کی جانچ کرنا ہوتا ہے۔ سیٹ امتحان دو طرح کے ہوتے ہیں۔ سیٹ ایک طرح سے دلائل پر مبنی ٹسٹ آف ریزننگ کی طرح ہوتا ہے۔ سیٹ دو مضمون پر مبنی امتحان ہوتا ہے۔ مقررہ وقت ایک گھنٹہ ہے۔ پرچہ معروضی سوالات پر مبنی ہوتا ہے۔ کچھ یونیورسٹیوں میں سیٹ دو امتحان میں شامل ہونا ضروری نہیں ہے۔ امتحان سے متعلق جانکاری کے لیے مندرجہ ذیل پتوں پر رابطہ کریں۔

☆ یونائیٹڈ اسٹیٹس فاؤنڈیشن ان انڈیا

☆ انسٹی ٹیوٹ آف سائیکولوجیکل اینڈ ایجوکیشن میجرمیٹ، 119/25 اے، مہاتما گاندھی روڈ، الہٰ آباد۔ 211001

☆ یو ایس اے ایجوکیشنل فاؤنڈیشن آف انڈیا، سندیپ، نیو مرین لائنس، ممبئی۔ 40002

☆ یو ایس اے ایجوکیشن فاؤنڈیشن امریکی سنٹرس آف انڈیا-12 ہولی روڈ، نئی دہلی۔ 110001

☆ یو ایس اے ایجوکیشنل فاؤنڈیشن آف انڈیا 38 اے، جواہر لال نہرو مارگ، کولکاتہ- 700071

ایم اے ٹی (میلر انالو جیز ٹسٹ)

مندرجہ ذیل پتے پر رابطہ کریں۔

سائیکولوجیکل کارپوریشن-75 اولڈ آف بلورڈ کلیو لینڈ، اوہیو-44130 یو ایس اے۔

ڈی اے ٹی (ڈینٹل ایڈمیشن ٹسٹ)

مندرجہ ذیل پتے پر رابطہ کریں۔

ڈویژن آف ایجوکیشن میجر مینٹس کاؤنسل آف ڈینٹل ایجوکیشن امریکن ڈینٹل ایسوسی ایشن-221، مشرقی شکاگو ایونیو، شکاگو الونس-6061 یو ایس اے

ایل ایس اے ٹی (لا۔ اسکول ایڈمیشن ٹسٹ)

مندرجہ ذیل پتہ پر رابطہ کریں۔

لا اسکول ایڈمیشن کاؤنسل باکس-2000، نیوٹاؤن پینسلوینیا-18940 یو ایس اے۔

ایم سی اے ٹی (میڈیکل سائنس ایڈمیشن ٹسٹ)

مندرجہ ذیل پتہ پر رابطہ کریں۔

ایم سی اے ٹی رجسٹریشن، امریکہ کالج ٹسٹنگ پروگرام، پی او باکس-414، 2235 شمالی ڈوبے روڈ، لوواسٹی، آیووا-53243 یو ایس اے

□□□

پتہ:
C/o Ashiq Ali
G-51/15, Shaheen Bagh Abulfazal Enclave,
Part 2, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025

خان قمر الزماں

ای۔لرننگ (E-learning)

مستقبل میں نئی نوکریوں اور نئے کیریئر کی سمت ای۔ایجوکیشن (E-education) اور ای۔لرننگ (E-learning) ہی طے کریں گے۔ مستقبل میں کیریئر پلاننگ کرنے والوں کا کام صرف روایتی اسکول، کالج اور نصابی تعلیم پر منحصر رہنے سے نہیں چلے گا کیونکہ ان کے ذریعے روزمرّہ ہونے والی تبدیلیوں اور جدید معلومات کی فراہمی کے امکانات کم ہیں۔ جس طرح ماضی کے گھوڑے، اونٹ اور بیل گاڑی کے سفر کے دو پہیے اور چار پہیے گاڑیوں کے علاوہ ریل اور جہاز نے مہینوں کے سفر کو گھنٹوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ اسی رفتار سے ماضی کے تعلیمی اور تدریسی طور طریقوں کو نئے زمانے کے مزاج کے مطابق ای۔لرننگ بدلنے جا رہا ہے۔

ان دنوں آپ نے ای۔میل (E-mail)، ای۔کامرس (E-commerce)، ای۔لرننگ (E-learning)، ای۔ایجوکیشن (E-education) وغیرہ نام اکثر سنے ہوں گے۔ ان سب ناموں میں "E" کا مطلب الیکٹرانک (Electronic) ہے۔ پچھلے دس سال میں دنیا میں انٹرنیٹ کے جال نے زندگی کے تمام شعبوں میں قدم جما لیے ہیں اور انسانی تاریخ میں پہلی بار پورے کرۂ ارض کو رشتے میں جوڑ دیا ہے۔ یہ رشتہ انفارمیشن ٹیکنالوجی (Information Technology) کی دین ہے۔ نئے زمانے کے تقاضوں کے لحاظ سے ہم خود کو اس سے دور نہیں رکھ سکتے۔ اس تبدیلی کو ہمیں خوش دلی سے قبول کرنا چاہیے۔ اس تبدیلی نے زمین پر موجود پورے انسانی سماج کو گلوبل ولیج (Global Village) کی صورت دے دی ہے۔

انٹرنیٹ ایک ایسی سہولت ہے کہ کرۂ زمین پر آپ کسی بھی جگہ ہوں وہاں سے لمحہ بھر میں کرۂ زمین کے دوسرے کسی بھی سرے پر بہت معمولی خرچ میں رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ یہ رابطہ صرف آواز، اور الفاظ کی تبدیلی کا ہی نہیں بلکہ مختلف رنگوں، تصویروں، اور ہنستی بولتی زندہ صورتوں کی ترسیل بھی ہو سکتی ہے۔ ماضی میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے جس بھاگ دوڑ، اور جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا آج وہ انٹرنیٹ کی مدد سے گھر بیٹھے منٹوں میں حل کی جا سکتی ہیں۔

ہمارے ملک میں بھی اب یہ عمل تیزی سے جاری ہے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں کلاس روم کی جگہ آن لائن (on-line) سیکھنے کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ کئی بیرونی ممالک کے ادارے ای۔لرننگ (E-learning) کی سہولیات فراہم کر رہے ہیں۔

ای۔لرننگ (E-learning) میں انٹرنیٹ کے ذریعے بے شمار مضامین مثلاً کاروبار اور ٹیکنیکل معلومات مینجمنٹ وغیرہ سیکھے جا سکتے ہیں۔ نوکری، بیوپار وغیرہ کے لیے درکار شخصیت سازی کی ٹریننگ اور ضروری معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ طلبہ آپس میں صلاح و مشورے سے اپنے مسائل حل کر سکتے ہیں۔ ہر طالب علم اپنی خواہش، مزاج، ارادوں اور سہولت کے مطابق تعلیم حاصل کر سکتا ہے۔ اس طریقے سے ہر سبق کو الگ الگ طریقوں اور مثالوں کے ذریعے سمجھایا جا سکتا ہے۔ بروقت معلومات، رابطے کی سہولت، طالب علم کے سوالات و مشکلات کی ماہرین کے ذریعے فوراً رہنمائی اس کی خصوصیات ہیں۔ ای۔لرننگ (E-learning) کے ذریعے الگ الگ امتحان لیا جا سکتا ہے۔ مقابلے کے امتحان، کوئیز، سروے، ٹریننگ، نوکریوں میں بھرتی، نصاب اور ڈگری اور ڈپلوما کی تعلیم کی سہولت حاصل ہوتی ہے۔

روزمرّہ کے کاموں میں خاص طور پر بزنس اور اکونومکس میں آن لائن (on-line) کے بڑھتے چلن کی وجہ سے اس شعبے میں بدعنوانیوں نے بھی بار پالیا ہے۔ جنھیں سائبر کرائم (Cyber Crimes) کے نام سے جانا جا رہا ہے۔ کریڈٹ کارڈ کے ذریعے ہونے والے لین دین میں گڑ بڑ پیدا کرنا۔ ای۔میل (E-mail) کے ذریعے ڈرانا اور خوف و ہراس پیدا کرنا۔ جھوٹے ای۔میل (E-mail) کرنا۔ کمپیوٹر کے سوفٹ ویئر کی پائیریسی (Piracy) کرنا۔ کمپیوٹر کے ذریعے بھیجے گئے پیغامات کو روک دینا۔ موبائیل فون کی کلوننگ کرنا وغیرہ وغیرہ نئے نئے جرائم اس فہرست میں شامل ہوتے جا رہے ہیں۔ اس طرح کی مجرمانہ سرگرمیوں، کی روک تھام کے لیے کمپیوٹر نیٹ ورک اور ڈیجیٹل فارینسک (Digital Forensics) کے ماہرین کی پورے ملک و بیرون ملک بڑی ڈیمانڈ ہو رہی ہے۔

□□□

پتہ:
Shah Babu Jr. College,
Patur, Dist. Akola
(M.S.) - 444501

رامسے کلارک روبرو

صارفیت اور مادیت کے خطرناک پہلو

رامسے کلارک ریاستہائے متحدہ کے سابق اٹارنی جنرل ہیں۔ انھوں نے امریکی تحریک برائے خانگی حقوق کے سلسلے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ جارج ڈبلو بش کی تعزیری کارروائی کی مخالفت کرنے والی تحریک سے منسلک رہ چکے ہیں۔ عراقی خصوصی عدالت کے سامنے صدام حسین کی حمایت کرنے والے وکلا کی جماعت میں شامل رہے۔ ماضی قریب میں وہ کولکاتا کے سفر پر تھے۔ وہاں ان سے مارکس ڈام نے جو انٹرویو کیا تھا اس کے چند اقتباسات پیش ہیں۔ یہ انٹرویو "دی ہندو" کی 17دسمبر 2007 کی اشاعت میں چھپا تھا جسے اردو میں جناب معیدالرحمٰن نے منتقل کیا ہے۔

س: اگر کوئی یہ بات کہے کہ مروجہ سیاسی محاورہ ''بین الاقوامیت'' ایک پرفریب نعرہ ہے، جس کے پیچھے ریاستہائے متحدہ امریکا موجودہ عالمی نظام میں اپنے مفادات کی توسیع کر رہا ہے تو اس پر آپ کا کیا ردِ عمل ہوگا؟

ج: میرا ماننا ہے کہ جو لوگ عالم کاری کی توسیع کے لیے کام کر رہے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ پوری دنیا نفسیاتی طور پر اپنے آپ کو ایک گروہ سمجھے اور یہ ان کے منصوبے کو آسان بنانے کے لیے ہے۔

س: عالم کاری کی لہر جو امریکی سرمایہ دارانہ طرز کو قبول کرنے سے مضبوطی سے جڑی ہوئی ہے، پوری دنیا میں عدم مساوات کو بڑھاوا دے رہی ہے۔ اس رویے کو آپ کس زاویے سے دیکھتے ہیں؟

ج: یہ تہذیب کے لیے، انسانیت کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔ نہ صرف سیاسی خطرہ بلکہ معاشی بھی۔ مزید برآں کہ یہ نوع انسانی کی رنگارنگ تہذیب و ثقافت پر حملہ ہے۔ ایک ٹیکنالوجی، ایک طرز تفریح، ایک اشیائے خورونوش، ایک زبان، جو صرف اقتصادی قوت پر مبنی ہو؛ یہ ذہنیت دنیا کے متعدد جہات میں پھیل رہی ہے۔ صارفیت اور مادیت کی اپنی ایک طاقت ہے اور شاید تہذیب و ثقافت سب سے زیادہ اس کی زد میں ہیں۔ جس طریقے سے یہ دنیا پر غالب آ رہی ہے۔ وہ افسوس ناک ہے۔

س: لیکن دنیا کے مختلف خطوں میں نمو پذیر ترقیات کے متبادل طریقہ ہائے کار، امریکی طرز فکر کے لیے جوابی حیثیت رکھتے ہیں جو اپنے ماتحت سیاسی اقتدار قائم کرنے کے خواہاں ہیں۔ اس پر آپ کی کیا رائے ہے؟

ج: میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ عالم کاری کے نتیجے میں پیدا شدہ مسائل سے آگاہی میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ ہم عالم کاری کی رفتار کو مدھم ہوتے ہوئے اور اس سے اہم بات یہ ہے کہ اس کے حقیقی معنی سے لوگوں کو آشنا ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں کہ انفرادی سماج پر عالم کاری کے کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

س: عالم کاری نو استعماریت کی ایک شکل بھی قرار دیا جا رہا ہے، کیا آپ اس سے متفق ہیں؟

ج: قدیم سرمایہ داری اور نئی عالم کاری کے طریقۂ کار کے درمیان فرق کی واضح مثال ہندوستان ہے۔ وہ ملک جو بیرونی استیلا کے ظلم و ستم کا شکار رہا جس کے نتیجے میں وہ مفلس و نادار تو بنا لیکن عالم کاری سے قبل تک، مثال کے طور پر ہندوستانی فلم اور صنعت و حرفت کو لیں، اس کی ظاہری شکل و صورت ہندوستانی ہی رہی۔ اب عالم کاری کی شدت زندگی کے ہر شعبے پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ خواہ وہ کامیڈی ہو یا سیر و تفریح۔ موسیقی بھی اب تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ فی الحقیقت یہ حالات صارفیت اور مادیت کو اسلحوں کے حصول سے زیادہ خطرناک بنا دیتے ہیں۔ قدیم استعماریت میں آپ اپنے دشمن سے بخوبی واقف تھے، آپ جانتے تھے کہ آپ کی پشت پر چھری ہے۔ آپ آگاہ تھے کہ اچھی زندگی کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ جدید صارفیت کے دور میں آپ محبوس اور بے خبر ہیں۔ جب ایک قیدی اپنی زنجیروں سے ناواقف ہوگا تو وہ بے بس ہوگا۔ اگر آپ گلوبلائزیشن/ عالم کاری کا مشاہدہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ کے تخیلات اور جذبات پر پابندی ہے، جو ایک تشویشناک امر ہے۔

س: ہمارے ملک میں ان دنوں ریاستہائے متحدہ کے ساتھ نیوکلیائی معاہدے پر دستخط کے سلسلے میں سیاسی مباحثے جاری ہے اور بائیں بازو اسے ایک علاحدہ معاملہ سمجھنے اور دونوں ممالک کے مابین مشاورتی طریقۂ کار کا حصہ نہ سمجھنے کو سادہ لوحی قرار دے رہا ہے، کیا آپ اس پر اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہیں گے؟

ج: ہندوستان کے لوگ بہت ذہین ہیں، وہ جانتے ہیں کہ وہ کیا کرنے جا رہے ہیں۔ اگرچہ ان کے اور امریکا کے مقاصد الگ الگ ہونے کے امکانات ہیں۔ مختلف وجوہات کی بنا پر دونوں جمع ہو رہے ہیں لیکن اگر آپ نیوکلیائی اسلحوں پر امریکا کے مضبوط حلیف ہیں تو پھر آپ عالم کاری کی توسیع اور تہذیبوں کو مٹانے پر آمادہ ہیں۔

س: یہاں ہم صرف نیوکلیائی اسلحہ معاہدے کی نہیں بلکہ نیوکلیائی باہمی تعاون کے مکمل معاہدے کی بات کر رہے ہیں؟ اس پر آپ کی کیا رائے ہے؟

ج: نہایت چابکدستی اور تیزی سے ٹیکنالوجی چیزوں کو بدل سکتی ہے اور بدلے گی۔ وہ اس صلاحیت کو دو چند کر دے گی جسے ہم اجتماعی تباہی کا اسلحہ (WMD) کہتے ہیں۔

امن کے نام پر نیوکلیائی ہتھیاروں میں اضافہ کرنے والے ممالک کی حفاظت کی اگر ہم بات کرتے ہیں تو کس امن کی بات کرتے ہیں؟ ان ممالک کے حوالے سے جو بہت زیادہ طاقتور ہیں یا عالمی امن کی؟ میرے کہنے کا منشا یہ ہے کہ اگر نیوکلیائی اسلحوں کا مالک صرف میں ہوں اور کہیں بھی اسے تقسیم کرنے کی استعداد محض میرے پاس ہے تو پھر امن پر میری ملکیت ہے اور کسی کی نہیں۔ یہ ناجائز موقف ہے۔ انسانیت کے خلاف شدید تخریبی موقف ہے۔

س: عراق میں امریکی جارحانہ جنگ کے خلاف مختلف مہمات سے آپ منسلک رہے ہیں اور ممتاز وکلا کی اس جماعت میں بھی شریک تھے جو صدام حسین کے دفاع کے لیے رضا کارانہ طور پر تشکیل دی گئی تھی۔ کیا گذشتہ چند مہینوں میں عراق کے تئیں امریکی موقف میں کوئی تبدیلی آئی ہے؟

ج: کیا اس جارحانہ جنگ میں امریکا کو کوئی قیمت نہیں چکانی پڑی؟ کیا عراقی مزاحمت شدید نہیں تھی اور امریکا کے لیے پریشان کن نہیں تھی؟ نہ صرف جانی نقصان کی رو سے بلکہ عالمی وقار اور عزت کی رو سے بھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو عالمی امن کے لیے یہ تباہ کن بات ہوتی۔ عراق نے تو امریکا کو دھول چٹا دی۔ درحقیقت امریکا کی یہ جارحانہ جنگ عظیم بین الاقوامی جرم تھا...... انسانیت پر ظلم...... عراق میں اگر آپ لوگوں کی حالت دیکھیں گے تو دل پھٹ جائیں گے۔ زندگی کی ہر سطح پر بربادی ہوئی ہے، ناقابل برداشت بربادی۔ انسانیت کے نقصان کی کوئی ایسی مثال ماضی میں نہیں ملتی۔ تقریباً ڈھائی ملین لوگ اپنے ملک سے باہر دربدر ہیں۔ ایک ملین سے زائد مارے جا چکے ہیں۔ 75 فیصد بغیر بجلی اور پانی کے رہ رہے ہیں۔ مزید یہ کہ ہمیشہ خدشہ لگا ہوا ہے۔ کسی بھی لمحے قتل کیے جانے کا اندیشہ لگا رہتا ہے۔ دنیا کو اس سے زیادہ تشویش ناک حالات دیکھنے پڑیں گے۔ اسے روکنے کے لیے ہمیں متحد ہونا چاہیے۔

س: وہ دہشت گردی، امریکا جس سے جنگ کرنے دعویٰ کرتا ہے کیا اس کی خود ساختہ ہے؟

ج: دہشت گردی کے نام پر جنگ دراصل اسلام کے خلاف جنگ ہے۔ اکثر سیاستداں اسے اسلامی دہشت گردی کا نام دیتے ہیں، فی الحقیقت وہ اسلام کو خطرہ تصور کرتے ہیں۔ اسلام کے خلاف جنگ دراصل مسلمانوں کے اس تناسب کو ختم کرنا ہے۔ جس کی نظیر اس سے پہلے دیکھنے کو نہیں ملتی۔

س: اسلام سے یہ خطرہ کیوں ہے؟ ریاستہائے متحدہ کے ناقدین کا کہنا ہے کہ یہ ایک نفسیاتی خوف ہے۔ جس طرح سرد جنگ کے دوران اس کے لیے کمیونزم ایک خدشہ بنا ہوا تھا، کیا آپ کے خیال میں اب یہ اسلام کی شکل میں ہے؟

ج: جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے اس نے اس زمانے میں بہتر کام انجام دیے جب کوئی اقدار واصول موجود نہیں تھے۔ مال وزر کی حرص اور قوت بازو کا دور دورہ تھا۔ امریکا میں اسلام ان افریقی امریکنوں کی زندگی میں پیوست ہو گیا، جو گلیوں میں ہونے والے تشدد میں ملوث ہوا کرتے تھے اور اپنی زندگی کے لیے جدوجہد کیا کرتے تھے۔ اچانک جب ان میں اسلام داخل ہوا تو وہ امن واطمینان، وقار اور عقیدے سے بہرہ ور ہوئے، ایسا عقیدہ جس پر وہ یقین کر سکتے ہیں۔

امریکا کا خوف برحقیقت ہے۔ عالم کاری کے در پردہ مادی اقدار ہیں جیسا کہ مارک ٹوین کا خیال ہے کہ اگر آپ زیادہ چیزیں پیدا کرنا چاہتے ہیں، زیادہ مکانات تعمیر کرانے کی خواہش رکھتے ہیں، کثیر مقدار میں چیزیں فروخت کرنے کی تمنا ہے، وافر مقدار میں روپیہ جمع کرنے کی آرزو ہے تو غیر ضروری اشیا کو ضروری بنا کر پیش کرنا ہوگا۔ اس کے نتیجے میں خطرناک واقعہ یہ برپا ہوگا کہ ہر ملک میں مالدار لوگ مالدار ترین اور غریب لوگ مزید مفلوک الحال ہوتے جائیں گے۔ عالمی پیمانے پر غریبوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ اسی کے ساتھ دولت کا ارتکاز بھی ترقی پر ہے۔ یہ ایک غیر صحت مندانہ رویہ ہے۔

امریکی حکومت کو ہمیشہ دشمن کی ضرورت رہتی ہے اور نئے دشمن کی تلاش درحقیقت اپنے ملک کو متحد رکھنے کا ذریعہ ہے۔ اپنے مقاصد کی تکمیل کا یہ ایک طریقہ ہے جسے بے اصولی کی انتہا کہا جا سکتا ہے۔ وطن کی محبت مقصود نہیں ہے، اصل محرک تو دوسروں پر تسلط اور ان کا استحصال ہے۔ اس طرح دشمنی کے لیے زمین تو ہموار کرنی ہی پڑتی ہے۔ پھر عسکری قوت کا معاملہ آتا ہے۔ امریکا دوسرے ممالک کے مجموعی بجٹ سے زیادہ اپنے ہتھیاروں پر صرف کرتا ہے۔ یہ بات اس وقت اور بھی سنگین ہو جاتی ہے جب امریکا نیوکلیائی ہتھیاروں کی افزائش پر دوسرے ملکوں کو صفحۂ ہستی سے ختم کرنے کی دھمکی دیتا ہے جب کہ وہ خود مختلف قسموں کے نیوکلیائی ہتھیار تیار کر رہا ہے اور ایسے ایسے راکٹ بنا رہا ہے جو ایک منٹ میں کہیں بھی داغے جا سکتے ہیں۔

س: دنیا کے مختلف خطوں میں ایسے ممالک ہیں جو ریاستہائے متحدہ کے تسلط کے خلاف ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج: استحصال کرنے کے لیے کسی پر آپ قابض ہوتے ہیں تاکہ آپ کسی طرح اس کی دولت حاصل کر لیں۔ اس کے مال وزر پر تصرف حاصل کرنے کے لیے آپ اسے زیر کرتے ہیں۔ آپ اسے اس بات سے غافل رکھتے ہیں کہ وہ تبدیلیوں کو محسوس کر سکے اور یہ دیکھ سکے کہ آپ اس کے ساتھ کیا کر رہے ہیں۔ اگر لاطینی امریکا کی نئی آزادی کا آپ مشاہدہ کریں تو یہ چونکانے والی ہے۔ قدیم کیوبائی انقلاب آپ کے سامنے ہے جس کا احیا ہی کرشمہ ہے۔

عرصے سے زبردست پابندیاں عائد ہونے کے باوجود خواندگی کی شرح وہاں کے نصف کرۂ جنوب میں سب سے زیادہ ہے۔ وینزوئیلا کو لیجیے کہ وہاں ارجنٹائنا میں کیا ہورہا ہے۔ برازیل اور چائل پر ایک نگاہ ڈالیے جہاں ایک عورت پنوچٹ کے ذریعے قید کرلی گئی۔ 1947 میں اس کے باپ کو قتل کردیا گیا، اب وہاں وہ صدارت کے عہدے پر ہے۔ ان ممالک نے غلامی کی زنجیروں کو توڑ دیا ہے اور وہ آگے بڑھ رہے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ ہندوستان بھی اپنے دشمنوں کو اسی نظریے سے دیکھ رہا ہے۔ حالانکہ قبل ازیں ایسا کبھی نہیں ہوا اور یہی رویہ چین کا بھی ہے۔ ان ممالک کے پاس طاقت ہے جس کی وجہ سے ان کی اہمیت ہے۔ ریاستہائے متحدہ ان پر آسانی سے اثر انداز نہیں ہوسکتا۔ اب ہمارا یہ فرض ہے کہ ان مسائل کے شعور کو عام کریں۔ عسکری قوت میں عدم تناسب کی وجہ سے ہم دہشت ناک خونیں دور سے دوچار ہوسکتے ہیں جو ابھی نظر نہیں آرہا ہے۔

ان تمام باتوں کے باوجود ہمیں اپنی اقدار کی جانب واپس آنا چاہیے جو محض صارفیت سے بدرجہا بہتر ہے۔ صارفیت کا مفہوم یہ ہے کہ مجھے صرف چیزیں چاہئیں، بہتر غذا، بہتر مکان اور ایک لمبی سی کار، بالفاظ دیگر دنیا کے ہر قسم کے کھلونے ہم اپنے بچوں کے لیے خریدنا چاہتے ہیں۔

❑❑❑

مترجم کا پتہ:
معید الرحمٰن
Jamia Secondary School
Jamia Millia Islamia,
Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-25

رام پرشاد بسمل کی آپ بیتی

مرتب: ڈاکٹر وشوامترا اپادھیائے/مترجم: احسان احمد صدیقی

رام پرشاد نے یہ آپ بیتی گورکھ پور جیل میں اپنی پھانسی 19 دسمبر 1927 کے دو دن قبل مکمل کی تھی۔ رام پرشاد بسمل کے سینے میں جو آگ تھی اور جو مقصد پیش نظر تھا اس کا خلاصہ انھوں نے اس آپ بیتی میں بیان کیا ہے، جس میں ان کی اپنی مفلوک الحال خانگی زندگی، نامساعد ایام، ایام جوانی، ازدواجی زندگی، والدین اور مذہبی وسیاسی تعلیمات کے ساتھ اپنے اندر پیدا ہونے والے حب وطن کے جذبے کی وجوہات، کاکوری ریلوے ڈکیتی، اپنی گرفتاری، جیل کے واقعات، پھانسی کی کوٹھری اور زندگی کے آخری لمحات کی باتیں بڑی دل خراش ہیں۔

صفحات: 109، قیمت -/33 روپے

تعلیمی تشکیل نو کے مسائل

مصنف: خواجہ غلام السیدین

یہ کتاب ماہر تعلیم خواجہ غلام السیدین کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ملک و بیرون ملک کے سیمیناروں میں پڑھے تھے۔ ان مقالوں میں انھوں نے تعلیمی عمل کو تدریسی اور تنظیمی دونوں نوعیتوں سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ موجودہ دور میں تعلیمی، مادی، سماجی اور اخلاقی ترقی سے متعلق جتنی نئی نئی تحقیقات سامنے آرہی ہیں اسی قدر ہم میں ناآسودگی اور بےچینی بھی بڑھتی جارہی ہے۔ ایسے میں محاسبے، تجزیے اور عمل میں کسی حتمی فیصلے تک پہنچنے کے لیے یہ کتاب ہماری ذہنی تربیت کرتی ہے۔

صفحات: 307، قیمت -/96 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دھلی کی جانب سے طلبه اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ھے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ھے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066

سید احتشام حسین

ہماری مطبوعات سے

اردو ادب اور انقلاب 1857

یہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اردو ادب دربار، خانقاہ اور بازار کی پیداوار ہے۔ بلاشبہ یہ صدیوں کے گذشتہ حقائق، حالات اور خیالات کے اتصال اور انتشار کے دقیق تاریخی عمل کا بہت سادہ سا بیان ہے۔ یہ مثلث نظام جاگیر داری، مذہبی و سماجی ماحول اور ادب میں عوام کی آرزوئے اظہار کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ حقیقت پُر معنی ہے کہ شمالی ہندوستان میں اردو شاعری کا آغاز اٹھارھویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں جاگیردارانہ نظام کے زوال کے ساتھ ہوا۔ اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہ دور اپنی ساری طاقت کھو چکا تھا اور ایک ختم ہوتے عہد کی قدروں کو بھی بیان کرنے کے قابل نہیں تھا۔ مبہم طور سے یہ ایک نئی بیداری کا بھی دور تھا اس نئے شعور کی ابتدا کا جو بدلتے ہوئے تاریخی، سیاسی اور سماجی حالات کا تقاضا تھا۔ اس وقت کی اردو شاعری درد و کرب، افراتفری، مایوسی اور تذبذب کی آئینہ دار تھی جس میں کسی قسم کے خیالات اور نظریات کی جستجو بے سود ہوگی۔ وہ ماحول جس میں یہ شاعر رہتے تھے، ان کی سرپرستوں کا مذاق جن کی وہ مدح کرتے تھے اور اکثر صورتوں میں عوام اور شعرا کے درمیان بےتعلقی، یہ ساری باتیں شاعری کے زوال کا موجب ہوئیں اور وہ محض ضلع جگت یا ایہام بن کر رہ گئی۔ ہیئت کے اعتبار سے معیار بہت بلند ہوا لیکن خیالات محدود ہو گئے اور شاعری روایات کی پابند ہوگئی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے قیام کے بعد ہی سے شعرا اور ادیب نئی صورت حال کی نزاکت سے آگاہ ہونے لگے۔ جب سراج الدولہ کو انگریزوں نے ہلاک کر دیا اس کا دوست اور رفیق کار راجہ رام نرائن موزوں درد سے تڑپ اٹھا:

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانا مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

اور مصحفی نے لکھا:

ہندوستاں میں دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بتدبیر کھینچ لی

پھر بغاوت رونما ہوئی۔ مبہم، غیر معین، غیر منظم لیکن شدید قومی جذبے کی سلگتی ہوئی آگ بھڑک اٹھی۔ چھوٹے بڑے بہت سے دربار جو شاعروں کے سرپرست تھے برباد ہو چکے تھے۔ اودھ کو، جو فنِ تہذیب کا بڑا مرکز تھا، 1856 میں انگریزوں نے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ دہلی میں مغل حکومت صرف نام کی رہ گئی تھی۔ ایک نئی سلطنت وجود میں آگئی جس کی جڑیں سرزمین ہند میں نہ تھیں اور جو ہندوستانی تمدن سے بیگانہ تھی۔ بغاوت یا اس کے نتائج سے متعلق اعلیٰ معیار کے ادبی کارناموں کی جستجو زیادہ سود مند نہ ہوگی اگرچہ ایسا ادب بھی موجود ہے۔ یہ زیادہ فائدہ مند ہوگا کہ ادب کو بھی ان خاص تاریخی اور معاشی قوتوں کی پیداوار سمجھا جائے جو خود بغاوت کا موجب ہوئیں۔ اس کے بعد کے ادب کے بیشتر حصے سے ایک مختلف رنگ نمایاں ہے۔ اس کے بعد کے شاعروں اور ادیبوں کو نئے انداز فکر کے راہنما قرار دیا جا سکتا ہے۔ جنھوں نے ادب کو قوم کے ارتقا میں ایک تعمیری عمل تصور کیا۔ ان کے خیال میں ادب کا کام لوگوں میں نیا شعور پیدا کرنا ہے۔ ان میں اہم ترین شخصیتوں کے نام یہ ہیں: سرسید احمد خاں، خواجہ الطاف حسین حالی، مولانا محمد حسین آزاد، ڈاکٹر نذیر احمد، مولانا شبلی، مولانا ذکاء اللہ، چراغ علی، محسن الملک اور وقار الملک۔ ان سب کا عقیدہ یہ تھا کہ ادب زندگی کے مطابق بھی ہو اور اس کے لیے فائدہ مند بھی۔ پہلے یہ شعوری طور پر ممکن نہ تھا۔

جب ہم اردو ادب پر بغاوت کے اثر کا ذکر کریں تو ہمیں اس حقیقت کو نہ بھولنا چاہیے کہ اس وقت اس بغاوت کی ماہیت کو واضح طور سے نہیں سمجھا گیا تھا۔ بیشتر حالتوں میں اسے قہر الٰہی، فریب تقدیر، آسمان کی چشمِ بد، انقلاب زمانہ، اور اعمالِ بد کی سزا تصور کیا گیا۔ اس اہم تاریخی واقعے کی انفرادی تعبیروں سے وہ غلط راہوں پر پڑ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بغاوت کی وسعت اور اصلیت کو سمجھنے کی کوئی کوشش نہ کی گئی۔ صرف یہی نہیں بعض حلقوں میں جو بظاہر انگریزوں کے زیر اثر تھے اس کا یہ مطلب لیا گیا کہ یہ موجودہ حکومت کے خلاف بغاوت ہے۔ یہ خیال اس قدر غالب ہوا کہ بغاوت کو قومی تحریک کے ساتھ وابستہ کرنے میں بہت دیر لگی۔ جوں جوں نیا مواد ہاتھ لگنے لگا اور مزید

"انقلاب اٹھارہ سو ستاون" سے ماخوذ، مصنف: پی۔ سی۔ جوشی / صفحات: 386، قیمت: 215 روپئے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔

حقائق کا انکشاف ہوگا بغاوت کا بے لاگ جائزہ لینے میں مدد ملے گی۔

پہلے ہم ان تصنیفات کا ذکر کرتے ہیں جو بغاوت کے دوران مرتب ہوئیں۔ ایسی بہت سی تصنیفات میں مندرجۂ ذیل اہم ہیں۔ خطوط غالب، دستنبو (غالب کا بغاوت کے ایّام میں فارسی زبان میں لکھا ہوا روز نامچہ) داستانِ غدر مصنفہ ظہیر دہلوی، تاریخ سرکشی بجنور مصنفہ سرسید احمد، رسالہ اسباب بغاوت ہند، مصنفہ سرسید احمد، تاریخ ہند جلد نہم مصنفہ ذکاء اللہ، روز نامچۂ غدر (انگریز کی تصنیف) ترجمہ ڈاکٹر نذیر احمد، آغا ہجو شرف (لکھنؤ کی غارت گری پر ایک طویل نظم) واجد علی شاہ، منیر شکوہ آبادی، بہادر شاہ ظفر اور برق لکھنوی کی بہت سی نظمیں اور فغانِ دہلی (پچاس نظموں کا مجموعہ جو سب سے پہلے 1861 میں شائع ہوا) اور مختلف نظمیں اور مقالے جو بغاوت کے دوران اور اس ہنگامے کے بعد زیادہ تر دہلی کے اخبارات میں شائع ہوئے اور بھی تصانیف ہیں لیکن ہم انھیں نظر انداز کرتے ہیں کیوں کہ ہمارا مقصد اس مقالے میں ایسی کتابوں کی فہرست فراہم کرنا نہیں ہے۔

مذکورہ بالا تصنیفات میں سے بعض کا تجزیہ کرنے سے ہم چند قابلِ ذکر نتائج پر پہنچتے ہیں۔ مشہور اردو شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالب کو اس دور کے تمدّن اور روایات کا بہترین ترجمان تسلیم کیا گیا ہے چونکہ وہ اسی قبیل کے تھے جس کے زوال پذیر مغل دربار کے دوسرے لوگ تھے اس لیے انھوں نے انگریزوں کے ساتھ تعلقات پیدا کر لیے تھے اور ان کے بعض اوصاف اور کارناموں کے مداح تھے۔ یہ پہلے اہم ادیب تھے جنھوں نے سائنس اور سیاسی تنظیم میں انگریزوں کے کارناموں کو کئی اعتبار سے مغل اعظم اکبر کی نسبت زیادہ ترقی پسندانہ پایا۔ اس کا ذکر انھوں نے اپنی ایک فارسی نظم میں کیا ہے۔ یہ نظم 1855 میں سرسید کی مرتب کی ہوئی ابوالفضل کی تصنیف ''آئین اکبری'' کے نئے نسخے کے لیے پیش لفظ کے طور پر لکھی گئی تھی۔ اس میں قدیم نظام پر ایسی جگر خراش نکتہ چینی کی گئی تھی کہ سرسید بھی اسے اپنی تالیف میں شامل کرنے پر رضا مند نہ ہوئے۔ غالب جو اس وقت بہادر شاہ کے دربار کے ساتھ وابستہ تھے، دہلی کے تمام عمائدین کے ساتھ قریبی تعلقات رکھتے تھے۔ جب بغاوت پھیلی تو وہ بھی ناچار اس میں الجھ گئے جب انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کر لیا تو ان کے گھر پر مہاراجہ پٹیالہ کی فوج کا پہرا بٹھا دیا گیا (کیونکہ یہ اس کے ایک معزز دوست کا مکان تھا) اس طرح یہ فتحیاب انگریزوں کی غارت گری اور آتش زنی سے بچ گئے۔ دوسری ادبی سرگرمیوں کے علاوہ غالب اس وقت فارسی زبان میں ایک روز نامچہ لکھنے میں مصروف تھے۔ اگر چہ یہ روز نامچہ ایک اچھا ادبی شاہکار تھا لیکن تاریخی اعتبار سے اس کی زیادہ وقعت نہ تھی۔ ان بیسیوں خطوط سے جو انھوں نے تمام ہندوستان میں رہنے والے طرح طرح کے لوگوں کو لکھے، دہلی کے حالات سے متعلق اچھی خاصی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ وہ کالوں اور گوروں کی دہشت انگیزی، انگریز اور ہندوستانی دوستوں اور مربیوں کی موت، دہلی کے فوجی چھاؤنی میں بدل جانے (جہاں کوئی کرفیو پاس کے بغیر گھوم پھر نہ سکتا تھا)، دہلی کے بے گناہ امرا کے مقدموں اور روز مرّہ کی زندگی کی مشکلات کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ ان واقعات کو کوئی سیاسی اہمیت نہیں دیتے لیکن وہ جانتے ہیں کہ پچھلا زمانہ لوٹ کر نہ آئے گا۔ ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے جس میں اسی واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

بسکہ فعّال ما یُرید ہے آج
ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا

بغاوت کے دب جانے کے بعد غالب دہلی کے لوگوں کے ساتھ بالعموم اور مسلمانوں کے ساتھ بالخصوص انگریزوں کے سلوک کے شاکی رہے۔ ان کے ایک دوست شیخ امام بخش صہبائی کو جو ایک جید عالم اور شاعر تھے، دو بیٹوں سمیت گولی سے اڑا دیا گیا۔ ممتاز عالم مولانا فصل حق کو انڈیمان بھیج دیا گیا جہاں انھوں نے بغاوت سے متعلق عربی زبان میں ایک کتاب بعنوان ''الثورۃ الہندیۃ'' لکھی۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کو قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ اردو زبان میں پہلے اہم ادبی اخبار کے بانی محمد حسین آزاد کے والد اور بلند پایہ مجتہد مولانا محمد باقر کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ غالب نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ان کی غزلیں اس ہنگامہ خیز دور میں پیدا ہونے والے درد و کرب کو مؤثر انداز میں ظاہر کرتی ہیں۔ اس زمانے کے بیشتر واقعات بہت سی تصانیف میں موجود ہیں مثلاً خواجہ حسن نظامی کی تصنیفات ''غالب کا روز نامچہ''، ''انگریزوں کی بپتا''، ''بہادر شاہ کا مقدمہ''۔ راشد الخیری کی تصانیف ''دہلی کی آخری بہار''، ''نوبت پنج روزہ''، امیر احمد علوی کی کتاب ''بہادر شاہ ظفر'' اور رئیس احمد جعفری کی تصنیف ''بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد''۔

منیر شکوہ آبادی دبستانِ لکھنؤ کے مشہور شاعر تھے جو نواب فرخ آباد کے دربار سے وابستہ تھے۔ انھیں گرفتار کر کے مقدمہ چلایا گیا اور انڈیمان بھیج دیا گیا۔ انھوں نے مختلف نظمیں لکھی ہیں جن میں انھوں نے اپنے ذاتی مصائب اور قومی تباہی کو بیان کیا۔

محمد حسین آزاد نے انگریزوں پر افواج مشرق کی فتح کے بارے میں ایک نظم لکھی۔ یہ 21 مئی، 1857 کو ان کے والد کے اخبار 'دہلی اردو اخبار' میں شائع ہوئی۔ حال ہی میں اس کا انکشاف ہوا ہے۔

ان کتابوں کا ذکر میں کر چکا ہوں جو مصنفین کے ذاتی تجربوں یا بغاوت سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کا نتیجہ تھیں۔ سرسید نے (جو ابھی "سر" کے خطاب سے سرفراز نہیں ہوئے تھے) "تاریخ سرکشی بجنور" لکھی۔ اس وقت تک انھوں نے مسلمانوں کے روشن خیال طبقے کی راہنمائی کی باگ ڈور نہیں سنبھالی تھی۔ ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ان کی کتاب "رسالہ اسباب بغاوت ہند" کی اشاعت کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ کتاب اردو میں لکھی گئی اور بعد میں اس کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ یہ کتاب واقعات کا محققانہ تجزیہ بہم پہنچاتی ہے۔ وہ سارا الزام برطانوی پالیسی پر رکھتے ہیں جس کے سبب انگریز ہندوستانیوں کی خیر خواہی سے محروم ہو گئے۔ ان کا بیان ہے" یہ سرکار کا کام تھا کہ وہ کوشش کرے اور رعایا کی ہمدردی حاصل کرے نہ کہ رعایا کا فرض کہ وہ حکومت کے لطف و کرم کو حاصل کرنے کی سعی کرے۔ اب برطانوی سرکار کو قائم ہوئے سو سال سے بھی اوپر ہو چکے ہیں لیکن اب تک اس نے لوگوں کے دل نہیں جیتے۔" خود سرسید کے کردار کی طرح یہ مقالہ بھی ایک بحث طلب دستاویز ہے لیکن پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ ہماری تاریخ کا کوئی بھی طالب علم اسے نظر انداز نہیں کرسکتا۔

ظہیر دہلوی ایک جواں سال مگر نامور شاعر تھے جو بہادر شاہ کے دربار سے وابستہ تھے۔ چند سال گزرنے کے بعد انھوں نے اپنی آپ بیتی لکھی اور اس کا نام" داستانِ غدر" رکھا۔ انھوں نے دہلی کے واقعات، اپنے مصائب اور ان لوگوں کے آلام جن پر باغیوں کے ساتھی اور ہمدرد ہونے کا شک تھا، تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں۔

ایک اور کتاب ہے جو نظموں کا مجموعہ ہے اور جس کا نام" فغانِ دہلی" ہے یہ 1861 میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب اس لیے قابلِ ذکر ہے کہ اس میں دہلی کی لوٹ مار اور بربادی سے متعلق کوئی چالیس شاعروں کی نظمیں جمع ہیں۔ ان نظموں میں زیادہ تر دہلی کے امرا اور شرفا کے مصائب کا بیان ہے۔ انھیں ایسی سختیوں کا سامنا کرنا پڑا جو انھوں نے پہلے کبھی نہ جھیلی تھیں۔ ان میں واقعات کا مبہم ذکر ہے اور ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان ہی زیادہ تر جور و ستم کا شکار ہوئے۔ کئی نظموں سے پتہ چلتا ہے کہ دہلی کا ایک بھی صحیح الجسم نوجوان پھانسی سے نہ بچا۔ بعض نظموں کے اختتام پر اس خوش امیدی کا اظہار کیا گیا ہے کہ دہلی از سرِ نو آباد ہوگی اور گزرے ہوئے اچھے دن پھر لوٹ آئیں گے۔

لکھنؤ کے شاعروں کی کئی نظموں کا بھی یہی لب و لہجہ ہے۔ ان میں وہ بادشاہ اور شہرِ لکھنؤ کے تئیں اپنی وفاداری کے راگ الاپتے ہیں جو کلیتہً تباہ ہو چکا تھا۔ دراصل یہ نظمیں قوم کا ماتم نہیں ہیں بلکہ معمولی واقعات کا مرثیہ ہیں لیکن ہم ان شاعروں پر نکتہ چینی نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے حبِ وطن اور قومی اتحاد کے جذبے پر مقامی وفاداری اور عقیدت کا رنگ غالب تھا۔

اردو ادب کی روایت پر بغاوت کے اثرات کا جائزہ لینے کے لیے ہمیں بغاوت کے بعد کے واقعات کا تجزیہ کرنا ہوگا اور یہ دیکھنا ہوگا کہ ان سے لوگوں کے دل و دماغ کس طرح متاثر ہوئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے برطانوی تاج کے حق میں انتقالِ اقتدار کے بعد مذہبی آزادی کا اعلان گویا ہندوستانیوں کو ایک بالواسطہ دعوت تھی کہ وہ مذہبی نقطۂ نظر سے سوچنے لگیں۔ اس نے متوسط اور اعلیٰ طبقوں کے ذہن میں یہ بات بھی ڈال دی کہ وہ صرف اپنے اپنے فرقوں کی بہبودی کا خیال رکھیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ ایک طرح سے احیائے مذہب اور ماضی کی شان پر فخر کرنے کا اشارہ تھا۔ بظاہر یہ بات عجیب لگتی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ 1857 کی جدو جہد کے بعد متحدہ قوم کے تصور کو اس سے نقصان پہنچا۔ تقریباً تمام ہندوستانی زبانوں کے ادیبوں کو اپنے آبا و اجداد کے کارناموں کی حسرت بھری یاد ستانے لگی۔ بے شک ایک لحاظ سے یہ بیداری کی علامت تھی لیکن مذہبی تنگ نظری ان کی تصنیفات کے قومی ادب کا جز بننے کی راہ میں حائل ہوئی۔ اگر صورت حال اس کے برعکس ہوتی تو بنکم چندر چٹرجی، سرسید، بھارتیندو اور ان کے رفقا حالی اور شبلی سے، کم از کم نفسِ مضمون کے اعتبار سے زیادہ بلند پایہ تصانیف حاصل ہوتیں۔ اگر ہم 1857 کے بعد کے دور کے ادب کا تجزیہ کریں تو ہم صاف طور پر دیکھ سکتے ہیں کہ مذہبی اندازِ فکر میں قومیت کا جذبہ پنہاں ہے لیکن اس کے واضح تر اظہار کے لیے ہمیں بیسویں صدی کی تصنیفات دیکھنی ہوں گی۔

پرتاپ نرائن نے" ہندی، ہندو، ہندوستان" کا نعرہ لگایا اور سرسید اور نذیر احمد مسلمانوں کا ایک علاحدہ قوم کی حیثیت سے ذکر کرنے لگے۔ اگر چہ حالات سے صاف صاف ظاہر ہے کہ وہ یا تو غیر ملکی خباثت کے زیر اثر تھے یا اپنی سادہ لوحی کے سبب گمراہ تھے۔

جب ہم جدید ادب کا مطالعہ کریں تو ہمیں اس کی دو متضاد خصوصیات کی طرف سے آنکھیں نہ بند کرنی چاہئیں یعنی ترقی پسندی اور رجعت پرستی، امید اور یاس خوف اور دلیری، حکمران طبقہ کے تئیں وفاداری اور اس کے طور طریقوں کے خلاف احتجاج یہ قومی شعور کی نشو و نما میں ایک اہم مرحلے کے آثار تھے۔ اس تازہ حاصل کیے ہوئے شعور کو نئے ادبی اسالیب میں ظاہر کرنے کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد ہم نظم و نثر کی نئی اقسام کا ظہور دیکھتے ہیں۔

ناول، ناٹک، انشا پردازی، سوانح نگاری، تنقید اور طویل تخلیقی نظمیں مروّج ہوئیں۔ کئی صورتوں میں یہ قدیم اور جدید اسالیب کا امتزاج عمل میں آیا۔ چھاپہ خانہ کے وجود میں آنے سے نئے اسالیب کی ترقی اور اشاعت میں مدد ملی۔

اگر ان بیانات کی روشنی میں ہم سرسید، آزاد، حالی، نذیر احمد، شبلی اور شرر کی تصانیف کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ وہ لوگوں کی ضروریات سے آگاہ تھے اور ان میں امید کی نئی روح پھونکنا چاہتے تھے۔ حالی ہمیشہ اس مقولے کے قائل رہے: ''ہمیں وقت کے ساتھ بدلنا چاہیے۔'' قرآن پاک کی تلاوت بارہ سو سال سے ہو رہی تھی لیکن کسی نے مسلمانوں کو انقلاب کی رفتار تیز کرنے کے لیے آیات کا حوالہ نہیں دیا تھا۔ اب حالی قرآن مجید کی مذکورہ ذیل آیت کا حوالہ دے رہے تھے: ''ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیر و اما بالنفسھم'' (خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ آپ اپنی حالت نہ بدلے) ان تمام ادیبوں نے تبدیلی کی ضرورت کو تسلیم کیا اور اس سے متعلق بہت کچھ لکھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے پیرو نا امیدی کو ترک کر دیں اور ایک نئی زندگی شروع کریں۔ یہ محض حسنِ اتفاق نہیں کہ سرسید، حالی، آزاد، شبلی اور شرر سبھی نے نثر اور نظم میں امید کو اپنا موضوع بنایا۔ انھوں نے خدمتِ خلق کے لیے ادب کو دنیاوی حقائق کا آئینہ دار بنایا تاکہ علم کی اشاعت ہو۔ لوگ تغیر زمانہ کو قبول کرنے پر آمادہ ہوں اور اس کے مطابق اپنی تقدیر کو ڈھال سکیں۔

اردو ادب میں قومی شعور کے ارتقا کی داستان قدرے طویل ہے۔ ان انشا پردازوں اور ان کی تصنیفات کے ناموں کا ذکر کرنا بھی ممکن نہیں جو بغاوت سے پیدا ہونے والے سیاسی شعور کا نتیجہ تھے۔ ان ادیبوں میں سے بیشتر نے سیاسی جور کے تاریک ترین ایام میں بھی لکھنا ترک نہ کیا۔ انھوں نے برج موہن چکبست کا ہمنوا ہو کر یہ نغمہ الاپا:

دل اسیری میں بھی آزاد ہے آزادوں کا
ولولوں کے لیے ممکن نہیں زنداں ہونا

اس مختصر مقالے کا مقصد یہ نہیں کہ قومی تحریک کی تاریخ بہم پہنچائی جائے جس کی اردو ادب میں عکاسی کی گئی ہے۔ مصنف کا منشا صرف یہ ہے کہ ان ادیبوں کی دلی اور دماغی کیفیت کی ایک جھلک دکھائی جائے جنھیں پُر آشوب سیاسی زندگی کے کھلے سمندر میں چھوڑ دیا گیا۔ اس بغاوت کے سبب ان کے دلوں میں دبا ہوا غصہ اور جوش پھوٹ پڑا اور انھوں نے ہندوستان کی آزادی اور ترقی کی خاطر اس سے آج تک کام لیا۔ اردو ادیبوں کی نگاہ میں بغاوت کا یہی مطلب اور اس کی یہی وقعت ہے۔

□□□

انیس کے سلام

مرتب: علی جواد زیدی

غزل کے تشکیلی مزاج میں عشق، اور سلام کو اعتقاد کے طور پر انفرادیت حاصل ہے۔ یہ وہ اعتقاد ہے جس میں اخلاقی، منقبتی، رثائی، مدحیہ اور بھگتی جیسے موضوعات شامل ہوتے ہیں۔ ابتدائی دور کے سلام پر اعتقاد کی ہی فضا چھائی ہوئی تھی لیکن یہی صنف جب انیس تک پہنچی تو اس میں ایک جدید ادبی لب و لہجہ قائم ہوا۔ انیس نے سلام میں رثائی موضوعات کے علاوہ ذاتی مسائل، زمانے کی ناقدری، معاصرانہ چشمک اور بلند خیالی جیسے مضامین کو جگہ دی۔

''انیس کے سلام'' مرتبہ علی جواد زیدی میں انیس کے تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ سلام شامل ہیں جس میں سلاموں کی تعداد 102 ہے۔

صفحات: 307، قیمت: -/60 روپے

اتحاد سے انتشار کی طرف

مصنف: پروفیسر مشیر الحسن

اودھ کی گم ہوتی ہوئی قصباتی تہذیب اس ہند ایرانی ثقافتی ورثے کی امین رہی ہے جو ہمارے صدیوں کے ثقافتی میل جول کی دین تھا۔ پروفیسر مشیر الحسن کی یہ کتاب جو ایک مورخ کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے مختلف مذہبی فرقوں کے ان باہمی تعلقات پر روشنی ڈالتی ہے جو کثرت میں وحدت کی آئینہ داری کرتے تھے۔ قصبات کی روزمرّہ کی زندگی رسم ورواج، سماجی اور مذہبی تقریبات، ان سب چیزوں کا ایسا دانشورانہ بیان جو دلچسپ بھی ہے اور خیال انگیز بھی۔

صفحات: 415، قیمت: -/216 روپے

اسلم پرویز

ہماری مطبوعات سے

بہادر شاہ ظفر

آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر پر گفتگو کے آغاز سے پہلے یہاں ایک انگریزی کتاب کا تذکرہ ضروری ہے جو حال ہی میں منظر عام پر آئی ہے اور جس کا آج ہر طرف چرچا ہے۔ سنہ 2006 میں شائع ہونے والی اس کتاب کا نام The last Mughal" ہے جس کے مصنف اسکاٹ لینڈ کے باشندے ولیم ڈیل رمپل ہیں۔ ڈیل رمپل کی یوں تو اب تک پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن ہندوستان کے آخری مغل شہنشاہوں کی تاریخ اور تہذیب سے متعلق ان کی تین کتابوں (1994) City of Djinns، White Mughals (2003) اور ان کی حالیہ کتاب (2006) The Last Mughal کو خصوصی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ The Last Mughals کا ذیلی عنوان The Fall of a Dynasty, Delhi 1857 ہے جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ کتاب دراصل بہادر شاہ ظفر پر نہیں بلکہ 1857 کی دہلی پر ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہ 1857 کی دہلی کے منظر نامے کا مرکزی کردار بہادر شاہ ظفر ہی تھے۔ 1857 کے دور کے برٹش حکمرانوں نے تو 1857 کی شورش کو ہماری زبان میں 'غدر' اور اپنی زبان میں Sepoy Mutiny کا نام دیا ہے لیکن ہندوستانیوں کے نزدیک 1857 برطانوی نوآبادیاتی حکمراں طاقت کے خلاف ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی کا دوسرا نام ہے، جو بہر حال ناکام رہی۔ ڈیل رمپل نے دراصل اپنی کتاب The Last Mughal میں بالخصوص دہلی کے حوالے سے 1857 کے تاریخی واقعے کی تعبیر تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں ڈیل رمپل کا موقف جو بھی ہے ہماری بحث کا موضوع نہیں۔

شاہ عالم ثانی (بہادر شاہ ظفر کے دادا) اور اکبر شاہ ثانی (بہادر شاہ ظفر کے والد) کے زمانے سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک یہ تین مغل بادشاہ اس تاریخی جبر کا شکار تھے جس کا نقطۂ عروج بہادر شاہ ظفر ثابت ہوئے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ شاہ عالم ثانی ایک معذور کی سی اور اکبر شاہ ثانی ایک مجبورِ محض کی سی زندگی گزار کر رخصت ہوئے جب کہ ظفر طوفان میں گھری ہوئی اس شکستہ کشتی کے مسافر تھے جس کے پرخچے اڑ رہے تھے اور اب اس کشتی کا مسافر یعنی بہادر شاہ ظفر طوفان میں ہچکولے کھاتا ہوا کبھی طوفانی موجوں کی ایال پکڑ کر ان پر سوار ہونے کی کوشش کرتا دکھائی دیتا ہے اور کبھی سانس پھول جانے اور دم گھٹ جانے کی کیفیت سے باہر آنے کے لیے ان لہروں کے وجود سے ذہنی طور پر فرار حاصل کرتا اور کبھی بالآخر ان کی طرف اپنے نحیف و نزار چہرے پر لہراتی ہوئی سفید ریشِ دراز کا پرچم صلح ان کے سامنے لہراتا دکھائی دیتا ہے۔ اس تماشے میں سارا کھیل تاریخی جبر کے اس نقطۂ عروج کا تھا جس کی نوک پر ظفر کی شخصیت رقص کر رہی تھی گویا بقول غالب وہ اس کیفیت سے گزر رہے تھے:

برنگِ شعلہ می رقصم بہ آتش   بسانِ موج می بالم بہ طوفاں

ایسے میں بہادر شاہ ظفر کو غدار سمجھنا ان کے ساتھ سراسر زیادتی ہوگی، ان پر ترس کھانا بھی ان کے ساتھ ایک ظالمانہ ہمدردی ہوگی۔ دراصل ان کی شخصیت کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ان کے ساتھ ایک تعلقِ خاطر (Empathy) استوار کرنے کی ضرورت ہے۔

بہادر شاہ ظفر چاہے اپنے آپ میں ایک غیر معمولی شخصیت کے مالک نہ ہوں لیکن وہ جس تاریخی جبر کی کوکھ سے پیدا ہوئے تھے اس نے خود بخود انھیں ایک غیر معمولی شخصیت میں ڈھال دیا تھا۔ اس شخصیت کا ایک داخلی اور دوسرا خارجی وجود تھا۔ بہادر شاہ ظفر کی داخلی شخصیت بھی علاحدہ علاحدہ دو وجودوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک ہندوستان کے شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کی وہ شخصیت جو شاہ عالم ثانی کے انگریزوں کا پنشن خوار ہونے کے بعد سے خود اپنے زمانۂ ولی عہدی تک اس کتھارسس کو اپنے وجود کے اندر جذب کرتی چلی آرہی تھی جو ان کے دادا اور باپ کا مقدر بن چکا تھا اور جو خود ان کا بھی مقدر تھا۔ اس کتھارسس کے ساتھ وہ اپنی شاعری کے ایک معتد بہ حصے میں نبرد آزما دکھائی دیتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

تسمہ تسمہ کر دیا بس کاٹ کر عاشق کی کھال
وہ فرنگی زادِ کلکتہ جو سیکھا ناپنا
ان روزوں اس گلی میں جاسوس جا بجا ہیں
کہہ دو کوئی ظفر سے واں آج کل نہ جاوے

"اٹھارہ سو ستاون کے راہ نما"، سے ماخوذ، صفحات: 276، قیمت: 349 روپئے
نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔

جہاں میں اور تو ڈرتے ہیں غیر سے لیکن
ظفر رہے ہے مجھے اپنے آشنا کا خوف
نصیب اچھے اگر بلبل کے ہوتے
تو کیوں پہلو میں کانٹے گل کے ہوتے
کھول دے صیاد تو کھڑکی قفس کی شوق سے
بلبل بے بال و پر ظالم کدھر اڑ جائے گی
یا تو افسر مرا شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

بہادر شاہ ظفر کا دوسرا داخلی وجود وہ تھا جو ان کی چہیتی نو عمر بیگم نواب زینت محل کے جن کے قبضے میں تھا، داخلی سطح پر اور لاشعوری طور پر اس جن کے ساتھ بھی وہ نبرد آزما تو تھے مگر المیہ یہ تھا کہ یہ نبرد آزمائی حریفانہ نہیں حلیفانہ خطوط پر جاری تھی۔ بہادر شاہ ظفر کا خارجی وجود مشترکہ ہندوستانی تہذیب کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ان کی وہ شخصیت تھی جسے لال قلعے کی پنشن یافتہ فرصت کی زندگی نے انھیں (ماسوا اکبر) اپنے پیش رووں سے بھی کچھ زیادہ ہی جلا بخش دی تھی ورنہ ایسا کیوں ہوتا کہ ہندوستان کی باغی فوج کے لیے ہندوستان کا دوسرا نام بہادر شاہ ظفر کی شخصیت بن گئی تھی جس کے بینر تلے وہ انگریزوں کے مقابلے پر آ کھڑی ہوئی تھی۔ تو یہ وہ سہ رخی جنگ تھی جس میں بہادر شاہ ظفر ہمیں مبتلا نظر آتے ہیں۔ اس اعتبار سے 1857 کی حشر خیزیوں کا سب سے بڑا جھکولا تو ظفر ہی کے حصے میں آیا۔ ایسی صورت میں انھوں نے کبھی بہادری کے پینترے بدل کر وار کیے تو کبھی بزدلی اور کبھی مصالحت کے پینترے بدل بدل کر وار روکنے کی بھی کوشش کی۔ وار کرنے کا عمل ان کے ساتھ کم اور روکنے کا زیادہ رہا۔ ایسی صورت میں ہم نہیں کہہ سکتے کہ 1857 کے ڈرامے کے اس کردار کو ہمارے فکشن کے نقاد ہیرو قرار دیں گے یا اینٹی ہیرو۔ لیکن یہ بھی طے ہے کہ جس ڈرامے میں اینٹی ہیرو ہوتا ہے اس کا کوئی ہیرو سرے سے ہوتا ہی نہیں اس لیے تماشائی اس اینٹی ہیرو ہی کو اپنا ہیرو مانتے ہوئے چلتے ہیں۔ اس اعتبار سے 1857 کی جنگِ آزادی کے بڑے سے بڑے جیالے سے پہلے اگر بہادر شاہ ظفر کا نہیں تو کس کا نام لیا جا سکتا ہے۔ شہر کے تاراج ہونے کے بعد قلعے سے فرار ہو کر ہمایوں کے مقبرے میں روپوش ہونا ایک حکمتِ عملی بھی تو ہو سکتا ہے اور اس حکمتِ عملی کو آج ہم برناڈ شا کے مشہور ڈرامے Arms and Theman کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ لیکن اس تاریخی جبر کا کیا کیا جائے جس کا ہرکارہ مرزا الٰہی بخش کے روپ میں وہاں پہنچ کر اس حکمتِ عملی کو ناکام بنا دیتا ہے۔ چناں چہ مرزا الٰہی بخش کی جوابی حکمتِ عملی بہادر شاہ ظفر کے ساتھ وہ کر گئی جو لال قلعے پر برستے ہوئے انگریز کی توپوں کے گولے نہ کر سکے تھے اور اس طرح (انگریزوں کا باغی؟) مغل شہنشاہ انگریزوں کے ہاتھوں غداری کا مورد الزام قرار دیا گیا۔ 'چہ دلاور است دزدے کہ بہ کف چراغ دارد'۔ پھر انگریزوں کے نہیں بلکہ تاریخی جبر کے اس باغی کو ایسی سزا دی گئی جو 1857 کے بڑے سے بڑے باغی کو بھی نہیں ملی تھی۔ اسے دوسرے باغیوں کی طرح نہ تو گولی سے اڑایا گیا اور نہ سولی پر چڑھایا گیا بلکہ ملک بدر کر کے جلاوطنی کی کرب ناک زندگی گزارنے کے لیے لے جا کر رنگون کی اجنبی سرزمین پر ڈال دیا گیا:

عدو زندہ سرگشتہ پیرامنت　　　بہ از خونِ او گشتہ بر گردنت

لیکن انگریزوں کی طرف سے بہادر شاہ ظفر کی جان، اس قدر کی پاس داری میں نہیں بخشی گئی کہ ہم عدو کے قتل کا بھی گناہ اپنی گردن پر کیوں لیں بلکہ اس لیے کہ انگریز انھیں اپنے ہندوستان، اپنی دلی اور اپنے لال قلعے سے دور بہت دور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے اور ایسا ہی ہوا بھی۔

ڈیل رمپل کے نزدیک 1857 کی دہلی ایک سلطنت کے زوال کا دوسرا نام ہے لیکن آج ہمارے لیے 1857 کی دہلی پانی پت کا وہ میدان ہے جہاں بہادر شاہ ظفر کے بینر تلے آزادی اور انقلاب کی پہلی (ناکام) جنگ لڑی گئی جس کے ٹھیک نوے سال بعد اس سے اگلی نسلوں کے ایک فرزند جواہر لال نہرو نے اسی لال قلعے پر بالآخر ہندوستان کی مکمل آزادی کا جھنڈا لہرایا۔

بہادر شاہ ظفر کا پورا نام ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ تھا۔ ان کی ولادت ان کے والد اکبر شاہ ثانی کے زمانۂ ولی عہدی میں اکبر شاہ ثانی کی ہندو بیوی لال بائی کے بطن سے ہوئی۔ ظفر کی تاریخ پیدائش 28 شعبان 1189ھ مطابق 14 اکتوبر 1775 ہے۔ وہ ہفتے کے روز غروب آفتاب کے وقت پیدا ہوئے تھے۔ ابو ظفر ان کا تاریخی نام تھا جس کے اعداد 1189 ہوتے ہیں۔ اسی رعایت سے انھوں نے اپنا تخلص بھی ظفر رکھا تھا۔ بہادر شاہ ظفر کے جد امجد شاہ عالم (ابن اورنگ زیب ثانی) کا لقب بھی بہادر شاہ تھا اس لیے 'بہادر شاہ ظفر' بہادر شاہ ثانی کہلاتے تھے۔ عرش تیموری کے بیان کے مطابق بہادر شاہ ظفر کا عرف مرزا اکّن تھا۔

اکبر شاہ ثانی کے گیارہ لڑکے اور چھ لڑکیاں تھیں۔ ظفر ان میں سب سے بڑے تھے۔ ظفر سے چھوٹے مرزا بابر اور ان سے چھوٹے مرزا جہاں گیر تھے جن کو بادشاہ ولی عہد بنانا چاہتے تھے۔ مغل بادشاہوں کا یہ دستور تھا کہ وہ اپنا ولی عہد اور جانشیں اس شہزادے کو مقرر کرتے تھے جسے وہ اس کا اہل سمجھتے تھے یا جسے وہ پسند کرتے تھے۔ کسی شہزادے کا محض فرزند اکبر ہونا ولی عہدی کی ضمانت نہیں تھا۔ شاہ عالم ثانی کے زمانے سے جب مغل بادشاہ انگریزوں کے پنشن خوار ہو گئے تو ایسٹ انڈیا کمپنی نے اکبر شاہ ثانی سے ولی عہدی کے انتخاب کا حق بھی

چھین لیا۔ چناں چہ اکبر شاہ ثانی کی ایک بیگم ممتاز محل نے، جو مرزا جہاں گیر کی والدہ تھیں، جب مرزا جہاں گیر کو ولی عہد نامزد کرانے کی کوشش کی تو انگریزوں نے ان کی اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ وہ اکبر شاہ ثانی کے فرزندِ اکبر مرزا ابوظفر ہی کو ولی عہدی کا مستحق سمجھتے تھے اور بالآخر وہی ولی عہد نامزد ہوئے۔

بہادر شاہ ظفر کے والد اکبر شاہ ثانی کا انتقال 1253ھ مطابق 1837 کو ہوا اور اسی کے ساتھ بہادر شاہ تخت نشین ہوئے۔ بادشاہت اگرچہ برائے نام تھی لیکن شاہانہ تزک و احتشام میں کوئی فرق نہیں آیا۔ شاہی رواج کے مطابق ساری رسمیں ادا کی گئیں اور یہ سکہ بھی کہا گیا:

بہ سیم و زر زدہ سکہ شد بفضلِ الٰہ   سراج دینِ نبی بو ظفر بہادر شاہ

1857 میں جو خلفشار بپا ہوا اس نے نہ صرف بہادر شاہ ظفر کی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا بلکہ پوری مغل سلطنت ہی کی بساط الٹ کر رکھ دی۔ اس طرح بہادر شاہ ظفر کی مدت بادشاہت صرف بیس سال رہی۔

بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں لال قلعے کا جو تہذیبی رنگ روپ تھا، جو معمولات شاہی تھے، قلعے کے جو محکمے تھے، جو سلسلۂ داد و دہش تھا، جو ٹھاٹ باٹ تھے اس پر لاتعداد مرقعے تالیف ہو چکے ہیں لہٰذا اس تفصیل میں یہاں جانے کی ضرورت نہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ بہادر شاہ ظفر نے مغلوں کی شاہی رواداریوں کی سخت مالی دشواریوں سے گزرتے ہوئے بھی نبھایا۔ انھیں کمپنی کی طرف سے صرف ایک لاکھ روپے ماہانہ پنشن ملتی تھی جس میں سے ان کی طرف سے مغلیہ خاندان کے ان افراد کے وظیفے بھی مقرر تھے جو لال قلعے کے مکین تھے۔ اس کے علاوہ دربارداری کا تزک و احتشام اور شاہی ٹھاٹ باٹ علاحدہ۔ چناں چہ ان اخراجات کو پورا کرنے کے لیے انھیں طرح طرح کے جتن کرنے پڑتے تھے۔ شہر کے مہاجنوں سے قرض لینا، ذاتی اراضیوں کو فروخت کرنا یا رہن رکھنا وغیرہ۔

جب انگریزوں نے شاہ عالم ثانی کو کمپنی کا پنشن خوار بنا کر لال قلعے میں بٹھایا تو گویا انھیں جہاں بانی کے بکھیڑوں سے آزاد کر دیا تھا یا یہ کہیے کہ ایک طرح سے بے دخل کر دیا تھا۔ اب انھیں لال قلعے کی زیبائشی سپاہ کے علاوہ کسی فوجی انتظام و انصرام کی بھی ضرورت نہ رہی تھی اور نہ ان کے مالی وسائل میں اس طرح کے اخراجات اٹھانے کی کوئی طاقت ہی تھی۔ جہاں بانی کے بکھیڑوں سے بے دخلی کی وراثت شاہ عالم سے اکبر شاہ ثانی کو اور پھر بالآخر ظفر کو منتقل ہوئی۔ چناں چہ بہادر شاہ ظفر کا بھی یہ عالم تھا کہ وہ مغل حکومت کی بقا کے خواب تو دیکھ سکتے تھے لیکن وقت پڑنے پر بہت کچھ چاہتے ہوئے بھی ان کے پاس اس کی حفاظت اور دفاع کا کوئی سامان نہیں تھا۔

بہادر شاہ ظفر کی بیگمات کی صحیح تعداد کا پتہ نہیں چلتا، مختلف ذرائع سے جو چند نام سامنے آتے ہیں ان میں شرافت محل بیگم، زینت محل بیگم، شاہ آبادی بیگم، اختر محل بیگم اور سردار محل بیگم کے نام شامل ہیں۔ دہلی اردو اخبار کی ایک خبر سے پتہ چلتا ہے کہ زینت محل بیگم کا اصل نام کچھ اور تھا جس کا پتہ نہیں چلتا۔ زینت محل کا خطاب انھیں بادشاہ کی طرف سے ان کے نکاح میں آنے کے بعد ملا تھا۔ زینت محل کے والد کا نام احمد قلی خاں تھا جن کا تعلق احمد شاہ درانی کے خاندان سے بتایا گیا ہے۔ زینت محل کے ساتھ بہادر شاہ ظفر کی شادی 1840 میں ہوئی تھی اس وقت ان کی عمر پینسٹھ سال اور زینت محل کی انیس سال تھی۔

عرش تیموری کے بیان کے مطابق بہادر شاہ ظفر کے سولہ بیٹے اور اکیس بیٹیاں تھیں۔ بیٹوں میں مرزا دارا بخت سب سے بڑے اور مرزا جواں بخت سب سے چھوٹے تھے۔ جواں بخت کی ولادت 1841 میں ہوئی تھی۔ ولی عہد کے انتخاب کا جو مسئلہ اکبر شاہ ثانی کو پیش آیا اور جس میں انھیں ناکامی ہوئی وہی صورت بہادر شاہ ظفر کے ساتھ بھی پیش آئی۔ زینت محل بیگم، بہادر شاہ ظفر کی سب سے کم عمر اور اتنی ہی چہیتی بیگم تھیں۔ اکبر شاہ ثانی کے انتقال کے بعد جب 1837 میں بہادر شاہ ظفر تخت نشیں ہوئے تو اسی کے ساتھ ان کے بڑے بیٹے مرزا دارا بخت کو ولی عہد بھی نامزد کر دیا گیا تھا۔ اس وقت تک لال قلعے کے منظر نامے پر بیگم زینت محل نمودار نہیں ہوئی تھیں۔ مرزا دارا بخت کا انتقال بہادر شاہ ظفر کی زندگی ہی میں 1849 میں ہو گیا تھا۔ اس دوران 1840 میں زینت محل بیگم بہادر شاہ ظفر کے نکاح میں آ چکی تھیں اور 1841 میں مرزا جواں بخت کی ولادت بھی ہو چکی تھی۔ مرزا دارا بخت کے انتقال کے وقت مرزا جواں بخت گویا آٹھ سال کے ہو چکے تھے اور گمان غالب ہے کہ بیگم زینت محل کے ذہن میں مرزا جواں بخت کو ولی عہد بنوانے کا خواب پلنا شروع ہو گیا ہوگا۔ مرزا شاہ رخ بہادر مرزا دارا بخت کے بعد بہادر شاہ ظفر کے دوسرے بیٹے تھے جو وزیر اعظم اور مختار عام کے فرائض انجام دے رہے تھے لیکن ان کا انتقال مرزا دارا بخت کے انتقال سے دو سال پہلے ہی 1847 میں ہو چکا تھا۔ بہادر شاہ ظفر کے تیسرے بیٹے مرزا کیومرث بھی جنھیں عرش تیموری اور مرزا غیاث الدین مصنف 'باغ شاداب' نے ولی عہد دوم بتایا ہے، 1857 سے قبل ہی کسی زمانے میں انتقال کر چکے تھے۔ اس طرح بہادر شاہ ظفر کے چوتھے بیٹے مرزا فخرو ولی عہد نامزد ہوئے لیکن ان کا انتقال بھی جولائی 1856 میں ہیضے کی بیماری میں ہو گیا۔ مرزا فخرو کے انتقال کے بعد جب ولی عہدی کا مسئلہ، جو اب ایک جھگڑے کی شکل اختیار کر چکا تھا، دوبارہ شروع ہوا تو بیگم زینت محل کے ایما پر بہادر شاہ ظفر نے مرزا جواں بخت کو ولی عہد نامزد کرانے کی کوشش کی لیکن انھیں یا زینت محل بیگم کو آخر تک اس میں قطعی کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی، اس لیے کہ انگریز اس تجویز کے سراسر خلاف تھے۔

بہادر شاہ ظفر کا سب سے بڑا اعزاز یہ ہے اور یہ اعزاز پوری تحریک میں

صرف انھی کے حصے میں آیا کہ ایسے حالات میں جب انگریز ساحل بنگال سے حشر برپا کرتے ہوئے جمنا پار کر کے دہلی تک پہنچ گئے تھے اور اس وقت گویا وہ شہنشاہ دہلی کے حلق میں انگلیاں ڈالے کھڑے تھے تو بھی میرٹھ کی باغی فوج 11 مئی، 1857 کو لال قلعے کی دیوار کے نیچے بادشاہ کو مخاطب کرتے ہوئے بقول ظہیر دہلوی (داستان غدر) یہی کہتی ہوئی جمع ہوئی:

''حضور بادشاہ سلامت آپ دین دنیا کے بادشاہ ہیں، آپ کو حق تعالیٰ نے بائیس صوبوں کا مالک کیا ہے، تمام ہندوستان آپ کا محکوم اور فرماں بردار ہے، ہندوستان کی رعیت آپ کی رعیت میں شمار ہوتی ہے، ہم لوگ آپ کے پاس فریادی ہیں، امیدوار انصاف ہیں۔''

لیکن جیسا کہ کہا گیا کہ جہاں بانی کی ڈور تو ان کے ہاتھ سے کب کی ان کے دادا شاہ عالم ثانی کے زمانے ہی سے چھوٹ چکی تھی ان کے پاس ملکی دفاع کے انتظام و انصرام کا بھی کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ لامحالہ بقول ظہیر دہلوی ان کا پہلا ردعمل اس یورش پر یہی ہونا تھا:

''میرے پاس خزانہ نہیں کہ میں تم کو تنخواہ دوں گا، میرے پاس فوج نہیں کہ میں تمھاری امداد کروں گا، میرے پاس ملک نہیں کہ تحصیل کر کے تمھیں نوکر رکھوں گا، میں کچھ نہیں کرسکتا ہوں مجھ سے کسی طرح توقع استطاعت کی نہ رکھو۔''

1857 کے ہنگامے کی ابتدا تو دراصل 26 فروری، 1857 کے آس پاس اس وقت ہو چکی تھی جب بیرک پور کی 19 نمبر پلٹن نے چربی والے کارتوس استعمال کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ 26 مارچ، 1857 کو منگل پانڈے کے خون میں جوش آیا اور اس نے میجر ہڈسن کو اور اس کے ساتھ ہی لیفٹننٹ واگھ کو اپنی گولی کا نشانہ بنایا۔ اپریل کے مہینے میں میرٹھ، انبالہ اور لکھنؤ میں بہت سے انگریزوں کے مکان جلا دیے گئے۔ پچاس سپاہیوں نے ان کارتوسوں کو استعمال کرنے سے انکار کر دیا جس پر ان کا کورٹ مارشل ہوا۔ اس پر 10 مئی کو میرٹھ میں ہنگامہ برپا ہو گیا، جیل کی دیواریں گرادی گئیں اور ہندو مسلم سپاہ انگریزوں کا خاتمہ کرنے پر تل گئیں۔ 10 مئی کی رات ہی میرٹھ کے سپاہی علمِ بغاوت بلند کرتے ہوئے دہلی کی طرف روانہ ہوئے اور 11 مئی 1857 کو پیر کے روز آٹھ بجے صبح یہ لوگ نعرے لگاتے ہوئے دہلی میں داخل ہوئے۔ 22 فروری سے 11 مئی تک تقریباً ڈھائی مہینے ملک کے مختلف مقامات میں جن میں 11 مئی کے بعد سے دہلی بھی شامل تھی، فوجی بدنظمی اور انگریزوں کے کشت و خون کی وارداتیں ہوتی رہیں لیکن بہادر شاہ ان معاملات سے یا تو بے خبر رہے یا زیادہ باخبر نہیں تھے۔

11 مئی 1857 سے 14 ستمبر 1857 تک جنرل بخت خاں کی قیادت میں دہلی میں انگریزوں سے مقابلہ جاری رہا۔ اس دوران انگریزوں کے جاسوسوں کا جال شہر اور لال قلعے میں پوری طرح پھیل چکا تھا۔ آخرکار 14 ستمبر، 1857 کو انگریزوں کی فوجیں دہلی میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئیں، 19 ستمبر ہفتے کے روز بادشاہ نے بھی قلعہ چھوڑ دیا اور ضعیف العمر بادشاہ اپنی بیگمات اور شہزادوں کے ساتھ نظام الدین چلے گئے۔ تین روز تک بہادر شاہ ظفر اور ان کا خاندان بے سروسامانی کی حالت میں ہمایوں کے مقبرے میں روپوش رہے۔ بخت خاں، بادشاہ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا تاکہ دہلی ہاتھ سے نکل جانے کے بعد بھی یہ جنگ بہادر شاہ ظفر کے جھنڈے تلے جاری رکھی جا سکے۔ دوسری طرف انگریز بادشاہ کے دہلی سے فرار ہونے کے خطرے کے پیش نظر بادشاہ کو جلد سے جلد گرفتار کر لینا چاہتے تھے، انھیں ڈر تھا کہ اگر بادشاہ فرار ہو گئے تو وہ اس ہندوستان گیر تحریک کا مرکز بنے رہیں گے۔ دوسری طرف انگریزوں کے وفادار اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ بادشاہ کو گرفتار کرا کے وہ انگریزوں کے حلقۂ مقربین میں داخل ہو جائیں۔ چناں چہ اس طرح مرزا الٰہی بخش کی معرفت جاں بخشی کی ضمانت پر بادشاہ کو گرفتار کر لیا۔ جب ہڈسن بادشاہ کو گرفتار کر کے لایا تو لال قلعے کے دروازے پر اس نے انھیں سانڈرس کے حوالے کر دیا۔ بادشاہ کو ناظر حسین مرزا کے مکان میں قید کر دیا گیا۔ دہلی کو خیر باد کہنے تک وہ اسی مکان میں رہے۔

1857 کے ہنگامے سے بھی بہت پہلے بہادر شاہ ظفر اپنے آپ کو جن لاچاریوں میں گھرا ہوا پاتے تھے اس کا منطقی نتیجہ بھی یہی تھا اور انگریزوں کی غلامی سے ملک کو آزاد کرانے اور مغل سلطنت کو نیست و نابود ہونے سے بچانے کا بھی جس کے درپے انگریز کب سے تھے، ایک ہی راستہ تھا کہ وہ 1857 کی یورش میں باغیوں کا ساتھ دیتے جو انھوں نے بالآخر کیا۔ اس میں ان کی طرف سے ابتدا میں جو تھوڑی رد و کد ہوئی وہ صرف اس لیے تھی کہ میرٹھ کی باغی فوج کا لال قلعے کی دیوار کے نیچے پہنچنا انھیں اولاً کوئی مقامی ہنگامہ معلوم ہوا جو انگریزوں کی طاقت کے مقابلے میں ان کے نزدیک ایک انتہائی نادانی کا اقدام تھا۔ لیکن جلد ہی انھوں نے یہ باور کر لیا کہ یہ تو ایک ملک گیر تحریک تھی جو شاید وہ کام کر سکے جو ان کی معذور بادشاہت نہیں کر سکتی تھی۔ چناں چہ ایسے وقت میں جب انگریزوں کی تلوار ان کے سر پر لٹک رہی تھی، باغی فوج کی قیادت قبول کرنا ظفر جیسے ضعیف العمر اور لاچار بادشاہ کے لیے کوئی معمولی اقدام نہیں تھا اور اس اقدام کی سب سے اذیت ناک سزا بھی انھی کو ملی۔

1857 کی بغاوت ناکام ہوئی، بہادر شاہ ظفر ہمایوں کے مقبرے سے گرفتار کر کے شہر دہلی کے ایک مکان میں قید کر کے رکھے گئے۔ ان پر انگریزی

حکومت کے خلاف بغاوت کا الزام عائد کر کے مقدمہ چلایا گیا۔ ان کے مقدمے کی کارروائی لال قلعے کے دیوان خاص میں عمل میں لائی گئی، یہ کارروائی یورپین فوجی کمیشن کے تحت کرنل ڈیوس کی صدارت میں 27 جنوری 1858 کو شروع ہوئی اور 9 مارچ 1858 کو یہ مقدمہ کمپنی کے حق میں اور بادشاہ کے خلاف فیصل ہوا۔ اس مقدمے میں جس بات پر بار بار زور دیا گیا اور جسے بالآخر ثابت بھی کر دکھایا گیا وہ یہی تھی کہ نہ صرف یہ کہ بادشاہ اس بغاوت میں پوری طرح ملوث تھے بلکہ بغاوت کے عمل میں آنے سے پہلے بھی باغیوں کے ساتھ ان کا ربط و ضبط تھا۔ چناں چہ مقدمے کے آخر میں جج نے اپنے بیان میں ایک جگہ لکھا ہے:

''ہم بادشاہ کو جو کٹہرے میں کھڑے ہیں، ان سے ساز باز کرتا پاتے ہیں۔ وہ پہلا نصب العین جس کی طرف وہ (باغی) پلٹے، وہ پہلا شخص جس سے انھوں نے التجا کی، یہی دہلی کے فرضی بادشاہ ہیں۔ یہ دیکھ کر معمولی عقل والا بھی کہہ سکتا ہے کہ ان میں پچھلا ربط و ضبط تھا کیا ہوا اگر بادشاہ کی شرکت بعد میں ہوئی۔''

انگریز عدالت نے جس بات کو یہاں بہادر شاہ ظفر پر فردِ جرم عائد کرتے ہوئے بیان کیا ہے ہم ہندستانیوں کے لیے جن کا ہندستان کی آزادی کا یہ خواب 1857 کے پورے نوے سال بعد 1947 میں پورا ہوا، کسی سپاس نامے سے کم نہیں۔

مقدمے کے فیصلے کے لگ بھگ سات ماہ بعد رنگون کے سفر کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ بہادر شاہ ظفر اور دوسرے سیاسی قیدیوں کی سواری کے لیے تین پالکی نما گاڑیاں اور چار گھوڑے خریدے گئے۔ لیفٹننٹ اومنی کو قیدیوں کا نگراں مقرر کیا گیا۔ گھوڑ سواروں کا ایک دستہ اور ایک فوجی بٹالین ان کے ہمراہ کی گئی۔ اس طرح 17 اکتوبر 1858 کی شام چار بجے سابق شہنشاہ دہلی اور مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ثانی نے دہلی کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا۔ سیاسی قیدیوں کا یہ قافلہ دہلی سے الہ آباد کے لیے روانہ ہوا۔ دہلی کے کمشنر نے اس امر کی اطلاع تار کے ذریعے گورنر جنرل کو پہنچادی۔ اومنی کو یہ ہدایات ملیں کہ وہ گورنر جنرل کی اطلاع کے لیے سفر کے دوران اپنی روزانہ کارروائی کی رپورٹ بھیجا کریں۔ اس ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اومنی نے اس سفر کی ڈائری لکھنی شروع کی۔ وہ جس جگہ بھی جاتے فوراً اپنی جائے قیام کے بارے میں گورنر جنرل کو اطلاع دیتے۔ اس ڈائری کا مضمون ایک ہی طرح کا ہوتا تھا بس مقام اور تاریخ بدلی ہوئی ہوتی تھی۔ مثلاً 29 اکتوبر 1858 کو وہ اطلاع دیتے ہیں:

''میں گورنر جنرل کی اطلاع کے لیے یہ عرض کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں کہ قیدیوں کی گاڑی آج صبح میری نگرانی میں یہاں تک پہنچ گئی ہے اور کل صبح چوبے پور کے لیے روانہ ہو جائے گی۔''

[انگریزی سے ترجمہ]

سیاسی قیدیوں کا یہ قافلہ جس محافظ انگریزی فوجی دستے کی کڑی نگرانی میں اپنی آخری منزل کی طرف جا رہا تھا اس کا نام نائنتھ لانسر تھا۔ مختلف مقامات پر قیام کرتا ہوا 13 نومبر 1858 کو یہ قافلہ الہ آباد پہنچ گیا۔ دہلی سے شاہی خاندان کے چار افراد یعنی محمد بہادر شاہ ظفر، نواب زینت محل بیگم، شہزادہ جواں بخت اور شاہ عباس تو باقاعدہ جلاوطن ہو کر سیاسی قیدیوں کی حیثیت سے روانہ کیے گئے تھے۔ 17 اکتوبر کو دہلی سے روانہ ہو کر چار دن کم ایک ماہ میں سیاسی قیدیوں کا یہ قافلہ 13 نومبر کو الہ آباد پہنچا۔ بظاہر دہلی سے الہ آباد تک کا سفر اتنا طویل نہیں سوائے اس کے کہ احتیاط کے طور پر یہ قافلہ الہ آباد کا سیدھا راستہ چھوڑ کر ایسے الٹے سیدھے راستے سے الہ آباد پہنچا ہو جو کسی کے خیال میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔ امکان غالب ہے کہ یہی حکمتِ عملی رنگون تک کے سفر میں آگے بھی اختیار کی گئی۔ ان کے ہمراہ شاہی خاندان کے کچھ اور لوگ بھی تھے۔ بحیثیت مجموعی سیاسی قیدیوں کی یہ جماعت تیرہ افراد پر مشتمل تھی جن کے نام اس طرح ہیں:

1۔ بہادر شاہ ظفر، 2۔ مرزا جواں بخت، 3۔ مرزا شاہ عباس، 4۔ زینت محل بیگم، 5۔ زمانی بیگم (زوجہ جواں بخت)، 6۔ رقیہ بیگم (ہمشیر زمانی بیگم)، 7۔ ممتاز بیگم (والدہ زمانی بیگم)، 8۔ تاج محل بیگم (زوجہ بہادر شاہ ظفر) 9۔ رحیمہ، 10۔ سلطانہ، 11۔ عشرت، 12۔ طہارت، 13۔ مبارک النساء (والدۂ شاہ عباس)

الہ آباد میں بادشاہ اور ان کے ساتھیوں کا قیام صرف تین روز رہا۔ یہاں حکومت کی جانب سے بادشاہ کے طبی معائنے کے لیے ڈاکٹروں کی ایک کمیٹی مقرر کی گئی۔ گورنمنٹ آف انڈیا کے سکریٹری ایڈمنسٹن نے گورنر جنرل کی طرف سے ایس۔ ایم۔ ہیڈوے کو اس سلسلے میں یہ مراسلہ روانہ کیا:

''گورنر جنرل چاہتے ہیں کہ آپ کی کمیٹی محمد بہادر شاہ کا غور وخوض سے طبی معائنہ کرے اور اس کی ایک رپورٹ گورنر جنرل موصوف کو بھیجی جائے۔ ساتھ ہی آپ مندرجہ ذیل امور پر اپنی رائے بھی تحریر فرمائیں:

کیا آپ کی کمیٹی بادشاہ کی موجودہ صحت، ضعیف العمری اور ان کی دہلی سے یہاں تک کی مسافت کے بعد طبی نقطۂ نگاہ سے ان کا فوراً ہی رنگون بھیجا جانا یا رنگون کے مخصوص مکان میں ان کا ٹھہرایا جانا یا آب و ہوا کے لحاظ سے صوبہ پیگو میں ان کے قیام کو غیر مناسب تو نہیں سمجھتی۔''

[انگریزی سے ترجمہ]

اس خط کے جواب میں ڈاکٹروں کی کمیٹی نے ہیڈوے کی معرفت گورنر جنرل کو یہ جواب بھجوایا:

''ان (بہادر شاہ) کی عام جسمانی حالت، ان کی صحت، ضعیف العمری اور طویل مسافت کے بعد بھی اس سے بدر جہا بہتر ہے جو

آپ خیال فرماتے ہیں۔ لہٰذا کیپٹی بادشاہ کا رنگون بھیجا جانا، یا ان کا رنگون کے مخصوص مکان میں ٹھہرایا جانا یا صوبہ پیگو کی مخصوص آب و ہوا میں اُن کا بھیجا جانا طبی نقطۂ نگاہ سے قطعی غیر مناسب نہیں سمجھتی۔"

[انگریزی سے ترجمہ]

15 نومبر 1858 کو گورنر جنرل کی منظوری کے بعد ڈاکٹر جونسن، سابق بادشاہِ دہلی کے ذاتی ڈاکٹر مقرر ہوئے اور اس امر کی اطلاع ہیڈ ے کو دے دی گئی۔ سکریٹری ایڈمنسٹن نے سیاسی قیدیوں کی الہٰ آباد سے روانگی سے قبل گورنر جنرل کی ہدایت کے تحت لیفٹننٹ اومنی کو ایک اور خط لکھا جس میں انھوں نے اومنی کو بتایا کہ گورنر جنرل کی یہ ہدایت ہے کہ ان لوگوں میں سے جو بادشاہ کے ساتھ دہلی سے آئے ہیں، جو لوگ رنگون جانا پسند کریں انھیں جانے دیا جائے، لیکن انھیں اس بات سے آگاہ کر دیا جائے کہ ان پر بھی وہی تمام پابندیاں ہوں گی جو دوسرے قیدیوں پر عائد ہوں گی۔ یہ بات ایک بار پھر واضح کر دی گئی کہ بہادر شاہ ظفر، زینت محل بیگم، جواں بخت اور شاہ عباس کو بہر حال رنگون ہی جانا ہے۔ اسی روز ایڈمنسٹن نے ایک خط پیگو کے گورنر کو بھی روانہ کیا، جس میں دہلی کے سیاسی قیدیوں کے بارے میں بعض اہم ہدایات دی گئی تھیں۔ اس خط کا مضمون یہ تھا:

"گورنر جنرل کی ہدایت ہے کہ ان قیدیوں کے ساتھ مہذب طرزِ عمل روا رکھا جائے۔ ان کے ساتھ کسی قسم کی بے حرمتی نہ ہو۔ ان تمام باتوں کا بھی خیال رکھا جائے جو ان کے تحفظ کے لیے ضروری ہیں۔

چاروں سیاسی قیدیوں کے ساتھ گیارہ افراد ہیں جن کی فہرست اس خط کے ساتھ بھیجی جا رہی ہے۔ یہ تمام لوگ وہ ہیں جنھوں نے اپنی مرضی سے سیاسی قیدیوں کے ساتھ آنا پسند کیا ہے۔ ان تمام لوگوں کو بھی قیدیوں کے ساتھ اسی عمارت میں رکھا جائے گا اور ان کے اخراجات بھی گورنمنٹ ہی برداشت کرے گی۔ ان کا خرچ ہر اعتبار سے فیاضی کے ساتھ اٹھایا جائے لیکن ان کو نقد رقم کے طور پر کوئی وظیفہ نہیں دیا جائے گا۔ ان کے کل اخراجات کا علاحدہ سے ایک ماہانہ بل بنا کر دفتر امورِ خارجہ کو بھیجنا ہوگا۔" [انگریزی سے ترجمہ]

ان تمام باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کو سیاسی قیدی بنا کر تو رکھا گیا لیکن ان کے ساتھ کسی قسم کی بدسلوکی نہیں کی گئی۔ ضعیف العمری کی وجہ سے ان کی صحت کا بھی پورا خیال رکھا جاتا تھا چناں چہ طبی معائنے کی رپورٹ کے بغیر انھیں الہٰ آباد سے رنگون کے لیے نہیں روانہ کیا گیا۔ اسی طرح بادشاہ کے جو متوسلین آخر وقت بادشاہ کا ساتھ دینے کو تیار تھے، انھیں بھی اس بات کی اجازت دے دی گئی تھی کہ وہ بادشاہ کے ساتھ رنگون جا سکتے ہیں، جہاں ان کے رہن سہن کا خرچ گورنمنٹ برداشت کرے گی۔ ان حقائق کی روشنی میں بہادر شاہ ظفر کی اس داستانِ غم پر بھی نظرِ ثانی کی ضرورت ہے جو بعض صاحب طرز ادیبوں نے بڑی رقت کے ساتھ قلم بند کی ہے۔

15 نومبر 1858 کو چار سیاسی قیدیوں اور ان کے گیارہ ہمراہیوں کا جو قافلہ الہٰ آباد سے رنگون کے لیے روانہ ہوا وہ ان افراد پر مشتمل تھا:

الف: بہادر شاہ/ب: جواں بخت/ج: شاہ عباس/د: زینت محل

1۔ احمد بیگ (خادم)/2۔ سلطانہ/3۔ عشرت/4۔ مبارک النساء بیگم (والدۂ شاہ عباس)/5۔ نواب شاہ زمانی بیگم/6۔ نیاز و (باندی)/7۔ حرمت بائی (باندی)/8۔ لطفن (باندی)/9۔ عبدالرحیم (خادم) 10۔ حسینی (باندی)/ 11۔ صندل (باندی)

اومنی نے بادشاہ کی ضعیف العمری کا خیال کرتے ہوئے دو مرد خادموں، احمد بیگ (بادشاہ کے لیے) اور عبدالرحیم (بیگم زینت محل کے لیے) کو خاص طور پر رنگون چلنے کے لیے مجبور کیا تھا۔ ان تمام افراد کی فہرست تیار کر کے اس خط کے ہمراہ بھیج دی گئی تھی جو پیگو کے کمشنر کو قیدیوں کی رنگون کے لیے روانگی کے سلسلے میں لکھا گیا تھا۔ وہ تمام لوگ جو الہٰ آباد تک بادشاہ کے ساتھ آئے لیکن جنھوں نے آگے جانے سے انکار کر دیا تھا ان کو الہٰ آباد کے قلعے میں محصور کر دیا گیا۔ جو افراد رنگون کے لیے بادشاہ کی روانگی کے بعد الہٰ آباد کے قلعے میں محصور کیے گئے ان کے نام یہ ہیں:

1۔ مرزا قیصر، 2۔ مرزا خضر، 3۔ جواں بخش (خواجہ سرا)، 4۔ تاج محل بیگم، 5۔ ممتاز دلہن بیگم، 6۔ رقیہ سلطان بیگم (زوجۂ ظفر)، (جواں بخت کی ساس)، (جواں بخت کی سالی)، 7۔ رحیمہ، 8۔ طہارت، 9۔ کیمیا، 10۔ وفادار، 11۔ راحت، 12۔ جمعیت، 13۔ مبارک

19 نومبر 1858 کو طلوعِ آفتاب کے وقت سیاسی قیدیوں کا قافلہ الہٰ آباد سے مرزا پور پہنچ گیا۔ مرزا پور سے گنگا کے راستے اگلے سفر کی تیاری کی گئی۔ ایک فوجی کشتی میں جس کا نام 'سور ما فلیٹ' تھا، قیدیوں کو سوار کر دیا گیا اور اس کشتی کو ایک فوجی اسٹیمر سے جوڑ دیا گیا۔ اس اسٹیمر کا نام تھا 'ٹیمز'۔ یہ اسٹیمر اسی روز یعنی 19 نومبر 1858 کو دو پہر دو بجے دریائے گنگا کے راستے کلکتے کے لیے روانہ ہو گیا۔ مرزا پور سے روانہ ہو کر یہ اسٹیمر 22 نومبر کو بکسر، 23 نومبر کو دیناپور، 25 نومبر کو مونگیر، 27 نومبر کو راج محل، 28 نومبر کو رام پور بلیا، 29 نومبر کو دمو در کلی، یکم دسمبر کو کھلنا اور 4 دسمبر کی صبح نو بجے ڈائمنڈ ہار بر پہنچ گیا۔ ڈائمنڈ ہار بر پر قیدیوں کو کشتی سے اتار کر انھیں انگریزی جنگی جہاز میگوائرا میں سوار کر دیا گیا۔ 4 دسمبر ہی کو ساڑھے گیارہ بجے دن کو یہ جہاز ڈائمنڈ ہار بر سے روانہ ہو کر اسی روز شام کو کیڈ گری پہنچ گیا جہاں سے دوسرے روز یعنی 9 دسمبر، 1858 کو چل کر یہ جہاز رنگون کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا اور سیاسی قیدیوں کو رنگون میں اتار دیا گیا۔

□□□

اردو کے مشہور اور مستند شاعر اور نقاد **خلیل الرحمٰن اعظمی** کی پانچ اہم کتابیں جو ایک عرصے سے نایاب تھیں، قومی اردو کونسل نے خصوصی اہتمام کے ساتھ شائع کی ہیں۔ ہر اچھی اردو لائبریری میں ان کتابوں کی موجودگی ضروری ہے

اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک

اپنے وقت کی سب سے اہم ادبی تحریک کا بھرپور تعارف جو ترقی پسند تحریک کے نام سے 1935 میں شروع ہوئی اور پندرہ سے بیس سال کی مدت میں جس نے ادیبوں اور شاعروں کی ایک پوری نسل کو متاثر کیا۔ اس تحریک کی موافقت اور مخالفت میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے غیر جانبداری کے ساتھ تحریک کے مثبت اور منفی پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے اور تحریک سے وابستہ اہم قلمکاروں کے فکر و فن پر بھی گفتگو کی ہے۔

صفحات: 410، سائز ڈیمائی، قیمت: -/241 روپے

مقدمۂ کلام آتش

خواجہ حیدر علی آتش کی شاعری پر یہ مبسوط مقالہ خلیل الرحمٰن اعظمی نے 1948 میں، جب وہ بی۔اے۔ کے طالب علم تھے، تحریر کیا تھا۔ جب یہ مقالہ بالاقساط ''نگار'' میں شائع ہوا تو نیاز فتحپوری نے اسے اپنے ادارتی نوٹ میں سراہتے ہوئے لکھا کہ'' جناب اعظمی جس وقتِ نگاہ اور امعانِ نظر سے کام لے رہے ہیں، وہ آتش کے باب میں اس وقت تک کسی بھی صاحب قلم کی طرف سے ظاہر نہیں ہوئی۔'' بابائے اردو مولوی عبدالحق، سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر عبداللہ، وحید قریشی اور دیگر کئی اکابر نے بھی اس مقالے پر اپنی بھرپور پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔

صفحات: 134، سائز ڈیمائی، قیمت: -/139 روپے

زاویۂ نگاہ

یہ خلیل الرحمٰن اعظمی کے نو تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ جن میں پانچ مضامین پانچ اہم شخصیتوں سرسید، ابوالکلام آزاد، جگر مرادآبادی، فراق گورکھپوری اور اختر الایمان کے حوالے سے ہیں۔ ایک مضمون میں'' اردو تنقید کے مسائل'' پر گفتگو ہے اور ایک مضمون کا عنوان ہے'' اردو نظم کا نیا رنگ و آہنگ'' باقی دو مضامین ہیں:'' اردو شعر و ادب میں علی گڑھ کا حصہ'' اور'' دو نئے شعری مجموعے''۔

صفحات: 184، سائز ڈیمائی، قیمت: -/138 روپے

فکر و فن

خلیل الرحمٰن اعظمی مروجہ تنقیدی اصولوں اور نظریات کی پابندی کو ناگزیر نہیں سمجھتے تھے۔ وہ ادب کا براہ راست مطالعہ کر کے ادب کی خصوصیت کو سمجھنے اور اس کا معیار متعین کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس کتاب میں ان کے دس مضامین شامل ہیں جو بالترتیب، غالب، ظفر، خواجہ میر درد، حسرت، داغ، مومن، جوش ملیح آبادی، جمیل مظہری، مجاز اور جذبی کے فکر و فن کے محاسبے پر مبنی ہیں۔

صفحات: 205، سائز ڈیمائی، قیمت: -/151 روپے

مضامین نو

یہ خلیل الرحمٰن اعظمی کے مضامین کا آخری مجموعہ ہے جو انھوں نے اپنی زندگی میں مرتب کیا۔ اس میں شخصیتوں پر بھی مضامین ہیں، عصری ادبی صورت حال کا بھی ذکر ہے، کچھ مسائل پر اظہار خیال ہے اور کچھ کتابوں پر تبصرے شامل ہیں۔ تبصرے انھی کتابوں پر ہیں جن کی اشاعت کے بعد ادبی منظرنامے میں کچھ چہل پہل نظر آئی اور مسائل بھی وہی اٹھائے گئے ہیں جو اہم تھے اور اہل نظر کی توجہ کے طلب گار۔

صفحات: 240، سائز ڈیمائی، قیمت: -/172 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دهلی کی جانب سے طلبه اور اساتذه کے لیے بالترتیب %45 اور %40 کی خصوصی رعایت دی جاتی هے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب هے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

اردو خبرنامہ

''جنگ آزادی کی تحریکات: ابتدا تا 19 ویں صدی''

قومی اردو کونسل کا سہ روزہ سیمینار

● مونگیر۔ 22 فروری، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے سہ روزہ سیمینار ''جنگ آزادی کی تحریکات: ابتدا تا 19 ویں صدی'' کا افتتاح رحمانی فاؤنڈیشن، مونگیر میں عمل میں آیا۔ یہ سیمینار رحمانی فاؤنڈیشن کے تعاون سے منعقد کیا گیا تھا جس کا افتتاح قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے سابق ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید نے کیا۔ مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر لطف الرحمن اور جناب جے پرکاش نارائن یادو، مرکزی وزیر حکومت ہند نے شرکت کی اور صدارت مولانا محمد ولی رحمانی نے فرمائی۔ اس موقع پر اسٹیج پر محترمہ فرحت رضوی اور قومی اردو کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر ابوبکر عباد بھی موجود تھے۔ ڈاکٹر علی جاوید نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ اردو ہمارا مشترکہ تہذیبی ورثہ ہے اس کی حفاظت ہندو اور مسلمان دونوں کی ذمے داری ہے۔ اگر ہم نے اس مشترکہ تہذیبی ورثے کی حفاظت نہیں کی تو ہندوستان کی سالمیت معرضِ خطر میں پڑ جائے گی۔ انھوں نے زور دیا کہ تاریخ سے ہمیں سبق حاصل کرنا چاہیے اور جن طاقتوں نے ماضی قریب میں ہندوستان کو تقسیم کیا ان کی سازشوں کا شکار ہونے سے بچنا چاہیے۔ ہندوستان کی سالمیت پر روز بروز نئے نئے خطرات منڈلا رہے ہیں اور ہماری قیادت ان سے بے خبر اور اپنے مفادات کی اسیر ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ان حالات میں ہندوستان اور ہندوستانی کلچر کی حفاظت ہماری سب سے بڑی ذمے داری ہے۔ اور یہ تب ہی ممکن ہے جب ہم ماضی قریب کی تاریخ سے سبق حاصل کریں، تقسیم ہند کے اصل ذمے داروں کو پہچاننے کی کوشش کریں اور اپنے مشترکہ تہذیبی ورثے کی حفاظت کریں۔

پروفیسر لطف الرحمن نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہندوستان میں جو تہذیبی رنگارنگی رہی ہے وہ ہندوؤں کی اعلیٰ ظرفی اور شرافت نفسی کا ثبوت ہے۔ انھوں نے کسی قوم کے ساتھ لڑنے جھگڑنے کے بجائے مل کر رہنے کو ترجیح دی۔ چنانچہ انگریزوں کی آمد سے پہلے ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں میں مثالی اتحاد پایا جاتا تھا۔ انگریزوں نے اس کو پارہ پارہ کیا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر ان پر حکومت کرنے کی پالیسی اختیار کی۔ ہمارے بعض سیاسی رہنما ان ہی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں اور یہ امر افسوسناک ہی نہیں تشویشناک بھی ہے۔ ہمیں ہوشیار رہنا چاہیے اور یہ ہوشیاری اپنے بزرگوں کے کارناموں کی صحیح تفہیم سے پیدا ہوسکتی ہے۔ اس سے یہ پتا چل سکتا ہے کہ ہمارے بزرگوں نے ہندوستان کی آزادی اور سالمیت کے لیے کیا کیا قربانیاں دی ہیں اور ہماری ذمے داریاں کیا کیا ہیں۔

مولانا محمد ولی رحمانی نے اپنی صدارتی تقریر میں ہندوستانی سیاست کے فرقہ وارانہ میلانات پر سخت تنقید کی اور مونگیر میں میر قاسم کی یادگاروں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کو مقامی ایڈمنسٹریشن کی فرقہ واریت قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ میر قاسم بازار کا نام تبدیل کر کے کرن بازار رکھ دیا گیا اور نام تبدیل کرنے والے وہ لوگ ہیں جنھوں نے راجہ کرن کی یادگار کی ایک ایک اینٹ بیچ ڈالی اب وہ راجہ کرن کی یادگار میر قاسم بازار کو بنا دینا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ بزرگوں کی اینٹوں کی حفاظت جو نہیں کر سکتا اس کا کام ناموں کے تبدیل کرنے سے نہیں چل سکتا۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ اپنے ماضی کو محفوظ کرنا سیکھو ورنہ ناموں کی یہ تبدیلی اسلاف کے کارناموں کو نہیں بچا سکتی۔ انھوں نے اس سیمینار کو اپنے تہذیبی ورثے کی حفاظت اور احیائے نو کی طرف قومی اردو کونسل کا نہایت اہم قدم بتایا۔ اس اجلاس سے جناب جے پرکاش یادو، مرکزی وزیر حکومت ہند، محترمہ فرحت رضوی (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی) اور ڈاکٹر ابوبکر عباد (پرنسپل پبلی کیشن آفیسر، قومی اردو کونسل) نے بھی خطاب کیا۔

دوسرا اجلاس دو پہر دو بجے شروع ہوا جس کی مجلس صدارت میں ڈاکٹر ابوبکر عباد، پروفیسر رضوان قیصر اور ڈاکٹر علی جاوید شامل تھے۔ اس اجلاس کی نظامت جناب جاوید رحمانی نے کی اور اس میں پہلا پرچہ پروفیسر لطف الرحمن نے ''مولوی محمد باقر'' پر پڑھا۔ دوسرا پرچہ ڈاکٹر محمد کاظم نے بعنوان ''1857 اور بنگال کا اردو ادب'' پیش کیا۔ ان کے بعد ڈاکٹر اشفاق عارفی اور جناب رضا عباس رضوی نے اپنے پرچے پڑھے۔ ان چاروں پرچوں پر طویل بحث ہوئی جس میں حصہ لینے والوں میں پروفیسر سلیمان خورشید اور ڈاکٹر شبیر حسن قابل ذکر ہیں۔ اپنی صدارتی تقریر میں پروفیسر رضوان قیصر نے سرسید پر پڑھے گئے ایک پرچے پر تفصیل سے گفتگو کی اور مقالہ نگار سے کئی سطحوں پر اختلاف کیا۔ ڈاکٹر علی جاوید نے اپنی صدارتی تقریر میں تمام پرچوں کے حوالوں سے گفتگو کی اور سرسید کے سلسلے میں چھڑنے والی بحث پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور کہا کہ انگریزوں کی حمایت کے مسئلے کو ہندو یا مسلمان کسی ایک مذہب سے مخصوص کر کے دیکھنا غلط ہے۔ اصل میں ہر قوم میں ہر طرح کے

لوگ موجود تھے۔ یوں انگریزوں کو ہندو اور مسلمان دونوں اپنا مشترک دشمن تصور کرتے تھے کیوں کہ دونوں کے مذہب کو ان سے خطرہ تھا۔ ایک طرف اگر ماسٹر رام چندر اور ان کے بھائی عیسائی ہو گئے تھے تو دوسری طرف ڈپٹی نذیر احمد بھی تبدیلی مذہب پر آمادہ تھے ان حالات میں ہندو اور مسلمان دونوں انگریزوں سے بے زار تھے اور ان کے خلاف صف آرا بھی۔

● مونگیر۔ 23 فروری، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے سہ روزہ سیمینار ''جنگ آزادی کی تحریکات: ابتدا تا 19 ویں صدی'' کے دوسرے دن کے پہلے اجلاس کا آغاز صبح 9.30 بجے رحمانی فاؤنڈیشن کے سیمینار ہال میں ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر ابوذر عثمانی اور پروفیسر سلیمان خورشید نے کی اور نظامت ڈاکٹر ابوبکر عباد (پرنسپل پبلی کیشن آفیسر، قومی اردو کونسل) نے۔ اس اجلاس میں جنگ آزادی سے متعلق مختلف تحریکات و رجحانات پر آٹھ مقالے پڑھے گئے۔ مقالہ نگاروں کے نام ہیں: جناب افسر کاظمی، جناب محمد حسان خاں، مفتی سہیل احمد قاسمی، جناب نورالحسن راشد، مولانا ثناالہدیٰ، جناب عمیر صدیقی ندوی، جناب انیس الرحمٰن قاسمی اور پروفیسر رضوان قیصر۔ تمام پرچوں پر گفتگو میں سامعین نے حصہ لیا اور جنگ آزادی سے متعلق تحریکات و رجحانات کا تاریخی اور ثقافتی نقطۂ نظر سے تجزیہ بھی کیا گیا۔ اپنی صدارتی تقریر میں پروفیسر سلیمان خورشید اور پروفیسر ابوذر عثمانی نے تمام پرچوں پر تفصیل سے اظہار خیال کیا۔ دوسرا اجلاس دوپہر دو بجے اسی ہال میں شروع ہوا جس کی صدارت جناب نورالحسن راشد اور محترمہ فرحت رضوی نے کی اور نظامت جناب جاوید رحمانی نے کی۔ اس اجلاس میں جناب سرفراز جاوید، جناب ارشد مسعود ہاشمی، محترمہ شیریں زباں خانم، جناب مختار احمد مکی، ڈاکٹر شبیر حسن، جناب خالد تبسم ایوبی، جناب راجندر پرساد سنگھ اور پروفیسر سلیمان خورشید نے اپنے مقالے پیش کیے۔ ان مقالوں کے حوالے سے سرسید کے نقطۂ نظر پر خاصی تفصیل سے بحث ہوئی جس میں مقالہ نگاروں کے علاوہ سامعین نے بھی حصہ لیا اور صدور نے اپنی صدارتی تقاریر میں اس بات پر زور دیا کہ کسی بھی تاریخی شخصیت پر لکھتے ہوئے ہمیں اس کی اصل شبیہ کو پیش نظر رکھنا چاہیے اور اپنی طبیعت اور اخلاقیات کی رعایت سے اس کا مجسمہ تیار کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے جو بدقسمتی سے پچھلے سو برسوں میں ہمارے مورخین سرسید اور دیگر اکابرین کی پرستش کے لیے کرتے رہے ہیں۔ تیسرا اجلاس شام 7.00 بجے شروع ہوا جس میں جناب محمد ارمان حسین، مولانا امتیاز رحمانی، مولانا محمد عارف رحمانی، مولانا مشیرالدین رحمانی، جناب اقبال حسن آزاد، جناب آفتاب احمد آفاقی، ڈاکٹر رضی الرحمٰن اور پروفیسر ابوذر عثمانی نے جنگ آزادی کی تحریکات کی مختلف جہتوں پر مقالے پیش کیے اور یہ اجلاس رات 9.00 بجے اختتام پذیر ہوا۔

● مونگیر۔ 24 فروری، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے سہ روزہ سیمینار ''جنگ آزادی کی تحریکات: ابتدا تا 19 ویں صدی'' کے تیسرے اور آخری دن کا اجلاس صبح 9.30 بجے رحمانی فاؤنڈیشن کے سیمینار ہال میں شروع ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر علی جاوید اور مولانا محمد ولی رحمانی نے فرمائی۔ اسٹیج پر کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر ابوبکر عباد بھی موجود تھے۔ نظامت جناب جاوید رحمانی نے کی۔ اس اجلاس میں تین مقالے پڑھے گئے۔ پہلا مقالہ پروفیسر منظر اعجاز کا تھا جس میں سرسید کی اسباب بغاوت ہند کا جائزہ لیا گیا۔ دوسرا مقالہ محترمہ فرحت رضوی نے پیش کیا جس میں جنگ آزادی میں خواتین کے کردار پر روشنی ڈالی گئی اور تیسرا مقالہ جناب جاوید رحمانی نے پیش کیا جس میں ناصر کاظمی کی ادارت میں شائع ہونے والے ''خیال'' کے 1857 نمبر کا جائزہ لیا گیا جو 1957 میں شائع ہوا تھا۔ یہ اختتامی اجلاس تھا چنانچہ ان مقالوں کے بعد اختتامی تقاریر کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس میں ڈاکٹر ابوبکر عباد نے اس سیمینار کے سلسلے میں اپنے معروضات پیش کیے اور مولانا محمد ولی رحمانی کا ان کے پُر خلوص تعاون کے لیے شکریہ ادا کیا۔ ان کے بعد جناب کھگیندر ٹھاکر نے اس سیمینار کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ نئے زمانے کی پہچان تین چیزوں سے ہوتی ہے۔ 1۔ تاریخ کی تشکیل میں عوام کی مداخلت، 2۔ سائنس کی ترقی اور 3۔ اپنی عقل کا استعمال اور اس معیار پر اگر ہم موجودہ صورت حال کا جائزہ لیں تو لگتا ہے کہ ہم نئے نہیں پرانے زمانے میں جی رہے ہیں جب سامراجی طاقتیں ہمارا رخ اور نصب العین متعین کرتی تھیں۔ ان حالات میں اس سیمینار کی اہمیت اور افادیت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم مجاہدین آزادی کے کارناموں کا جائزہ اپنے نقطۂ نظر اور آزادیٔ فکر کے ساتھ لیں اور ان کی یادگاروں اور قربانیوں کو محفوظ کرنے کی کوشش کریں۔ انھوں نے اس سیمینار کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور رحمانی فاؤنڈیشن کا شکریہ ادا کیا۔ ڈاکٹر علی جاوید نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ حکومت اگرچہ جناب ارجن سنگھ کی قیادت میں ہندوستانی مجاہدین کے کارناموں کو محفوظ کرنے کی کوشش کر رہی ہے لیکن پورا نظام اس کی موافقت نہیں کرتا اسی لیے ان کوششوں کا کوئی ٹھوس نتیجہ سامنے نہیں آپا رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مونگیر میں میر قاسم بازار کے ساتھ جو سلوک کیا گیا اس کا ذکر آ چکا ہے، نیپال میں ہماری عظیم مجاہد آزادی حضرت بیگم محل کی قبر نہایت خستہ حالت میں ہے۔ اس سلسلے میں نرملا دیش پانڈے کی قیادت میں کلدیپ نیر اور ہم لوگوں نے وزیر اعظم جناب منموہن سنگھ سے ملاقات کی اور مطالبہ کیا کہ ہندوستان کی حکومت نیپال کی حکومت سے رابطہ کر کے اس مزار کی

حفاظت اور رکھ رکھاؤ کی ذمے داری اپنے سر لے لے لیکن حکومت نے اس سلسلے میں ابھی تک کچھ نہیں کیا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آزاد ہندوستان کی قیادت اپنے عظیم مجاہدین آزادی کی باقیات اور یادگاروں کے سلسلے میں کتنی سنجیدہ ہے! ان حالات میں ہمیں چاہیے کہ اپنے قومی ورثے کی حفاظت کے سلسلے میں جو کچھ ممکن ہو اپنے طور پر کریں۔ مجلس صدارت کے دوسرے رکن مولانا محمد ولی رحمانی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ آزاد ہندوستان میں ہمیں تقریر کی آزادی تو ہے لیکن ہماری سوچوں پر پہرہ بٹھا دیا گیا ہے اور ہم نے اب تک اپنے قومی ورثے کو دوسروں کی آنکھوں سے دیکھا ہے جب کارل مارکس کے حوالے سے یہ کہا جاتا ہے کہ انگریز ہندوستانی ترقی اور مساوات میں غیر محسوس طور پر حصہ دار بنے تو ہمارے مورخین بھی ایسا ہی سوچنے اور لکھنے لگتے ہیں جب کہ آزاد ہندوستان میں ہماری ترقی اور مساوات کا گراف قدیم ہندوستان کے مقابلے میں بہت نیچے ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں اپنی تاریخ اپنے طور پر تیار کرنی چاہیے کارل مارکس بہرحال ایک غیر ہندوستانی تھا اسے کیا معلوم کہ قدیم ہندوستان میں غلام خاندان کی سلطنت کی تاریخ بھی ملتی ہے۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ آزاد ہندوستان کو مغربی مورخوں کے نقطۂ نظر سے ہندوستان کو دیکھنے کے بجائے تاریخ کا ایک ایسا نقطۂ نظر وضع کرنا چاہیے جو دیکھ سکے کہ آزاد ہندوستان میں بظاہر تو بہت سی آزادیاں ہیں لیکن بباطن کچھ ایسی پابندیاں ذات، مذہب اور طبقوں کی ہیں جو قدیم ہندوستان میں نہیں تھیں یا بہت معمولی حد تک تھیں لیکن آزاد ہندوستان ان کے شکنجوں میں جکڑا ہوا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کوئی قوم جب اپنی تاریخ کے سلسلے میں کسی دوسری قوم پر انحصار کر لے تو اس کا حال وہی ہوگا جو آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کا ہو رہا ہے۔ انھوں نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا شکریہ ادا کیا اور ڈاکٹر علی جاوید کا بطور خاص شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود ہمارے لیے وقت نکالا اور ہمارے سیمینار کو صحیح رخ پر چلانے میں ہماری مدد کی جس کے لیے ہم بطور خاص ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ انھوں نے خانقاہ رحمانیہ اور رحمانی فاؤنڈیشن کی طرف سے ان کو شال پیش کی۔ اس طرح یہ سہ روزہ سیمینار بحسن خوبی اختتام پذیر ہوا۔

معاصر اردو شاعری پر سہ روزہ سیمینار

● نئی دہلی۔ موجودہ ادبی منظرنامے میں بہت کچھ بدل گیا ہے لیکن اکثر لوگوں کو اس کا احساس نہیں۔ موجودہ عہد نظریوں کے رد کا دور ہے۔ کیونکہ ہر نظریہ ادعائیت کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ بعینہ ایسا ہے جیسے ریشم کا کیڑا اپنے گرد جالا بنتا ہے اور بالآخر اسی میں گھٹ جاتا ہے۔ ادب بہتا ہوا دریا ہے جو نئی کھیتیوں کو سیراب کرتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر گوپی چند نارنگ نے معاصر اردو شاعری کے موضوع پر منعقدہ ساہتیہ اکادمی کے سہ روزہ (20,21,22 مارچ 2009) قومی سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں کیا۔

اس موقع پر مہمان خصوصی مظہر امام نے کہا کہ ادب کا مطالعہ دلجمعی کے ساتھ کیا جانا چاہیے۔ انھوں نے نئے اسالیب، نئے موضوعات کا ذکر کرتے ہوئے نئی شاعری کے امکانات پر بھی روشنی ڈالی۔ جبکہ نظام صدیقی نے نئے عہد کی شعری تخلیقیت کی تیسری کائنات کے موضوع پر خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ نئی نسل کی شاعری معیاری ہے اور اس نسل سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ ساہتیہ اکادمی کے نائب صدر پروفیسر ایس ایس نور نے نئی فکریات اور نئی شعریات پر گفتگو کی۔ اس سے قبل محترمہ رینوموہن بھان نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور آخر میں ساہتیہ اکادمی اردو مشاورتی بورڈ کے کنوینر عنبر بہرائچی نے تمام مندوبین اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ افتتاحی جلسے کے بعد سیمینار کے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر وہاب اشرفی نے کی۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے ''اردو غزل کا جدید اور مابعد جدید منظرنامہ'' پر مقالہ پیش کیا۔ اے جے مالوی نے ''معاصر اردو غزل کے امتیازات'' او رسیفی سرونجی نے 80 کے بعد اردو غزل: ایک تنقیدی جائزہ'' پر مقالہ پیش کیا۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کی۔ ڈاکٹر انور پاشا نے ''معاصر اردو نظم: ایک تنقیدی جائزہ''، ڈاکٹر شہزاد انجم نے ''معاصر اردو نظم کے اہم نشانات'' اور ڈاکٹر کوثر مظہری نے ''80 کے بعد اردو نظم اور اسلوب اظہار'' کے موضوع پر مقالے پیش کیے۔ پہلے دن کے تیسرے اور آخری اجلاس میں ایک شعری نشست بھی آراستہ کی گئی جس کی صدارت پروفیسر شہریار نے کی اور چندر بھان خیال، عبدالاحد ساز، پرتپال سنگھ بیتاب، جینت پرمار اور ف.س.اعجاز نے اپنی شاعری سے سامعین کو محظوظ کیا۔

معاصر اردو شاعری کسی بھی نوع کے نظریاتی حصار کے خلاف ہے۔ موجودہ ادبی منظرنامے میں جو شاعری پروان چڑھ رہی ہے وہ اپنی اقداری ترجیحات خود طے کر رہی ہے۔ ان خیالات کا اظہار کناڈا سے تشریف لائے نقاد اور شاعر ڈاکٹر سید تقی عابدی نے معاصر اردو شاعری کے موضوع پر منعقدہ ساہتیہ اکادمی کے سہ روزہ قومی سیمینار کے دوسرے دن کے پہلے اجلاس میں کیا۔ اس اجلاس میں تین مقالے پڑھے گئے۔ خالد محمود نے ''80 کے بعد اردو نظم کا منظرنامہ'' اور ارتضیٰ کریم نے ''80 کے بعد آزاد نظم'' پر مقالے پیش کیے۔ جبکہ امتیاز احمد نے ''80 کے بعد نثری نظم'' پر مقالہ پڑھا۔ دوسرے اجلاس میں شعری نشست آراستہ کی گئی جس کی صدارت بلراج کومل نے کی اور

کرشن کمار طور، سید تقی عابدی، عنبر بہرائچی، عبید صدیقی اور مدحت الاختر نے اپنی شاعری پیش کی۔ تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر صادق نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ اردو غزل سب سے مقبول ترین صنف سخن ہے۔ اس اجلاس میں بھی تین مقالے پیش کیے گئے۔ اس اجلاس میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے بھی حصہ لیا۔ انھوں نے کہا کہ معاصر اردو شاعری بہتے ہوئے دریا کی مانند ہے اور اس میں تہذیبی امتیاز وانفراد کے بھید بھرے سنگیت سنے جاسکتے ہیں۔ کوثر صدیقی نے ''معاصر اردو غزل: تنقیدی جائزہ'' اور مولا بخش نے ''مابعد جدیدیت اور معاصر اردو غزل'' کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ شافع قدوائی نے ''معاصر اردو غزل: مابعد جدیدیت ثقافتی نشانات'' کے موضوع پر مقالہ پیش کیا۔ بعد ازاں ایک شعری محفل ہوئی جس کی صدارت انیس انصاری نے کی اور عازم گروندر سنگھ کوہلی، اسد رضا اور نعمان شوق نے اپنے کلام سے سامعین کو نوازا۔

معاصر شاعرات مختلف جہات سے ادبی منظرنامے پر اپنے استحقاق اور شناخت کے لیے جہد مسلسل میں مصروف ہیں۔ پرانی شاعرات نے شمع محفل بنے رہنے کو پیش نظر رکھا تھا مگر آج کی شاعرات ساری دنیا میں اپنی حیثیت اور سماجی، تہذیبی وادبی برابری کے لیے کوشاں ہیں۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے معاصر اردو شاعری کے موضوع پر منعقدہ ساہتیہ اکادمی کے سہ روزہ قومی سیمینار کے تیسرے اور آخری دن کے پہلے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے کہا۔ اس اجلاس میں تین مقالے پڑھے گئے۔ چودھری ابن النصیر نے ''برصغیر کی معاصر خواتین: امتیازی نشانات'' اور حقانی القاسمی نے ''تانیثیت اور معاصر اردو شاعری'' کے موضوع پر مقالے پیش کیے جبکہ وسیم بیگم نے ''ہندوستان کی اہم معاصر خواتین شعرا اور ان کے مسائل'' پر مقالہ پڑھا۔ حقانی القاسمی نے تانیثیت بطور تحریک کو بہ دلائل رد کیا۔ ان مقالوں پر سیر حاصل بحث ہوئی۔ اس اجلاس کے بعد ایک شعری محفل آراستہ کی گئی جس کی صدارت مخمور سعیدی نے کی اور شین کاف نظام، فرحت احساس، مہتاب حیدر نقوی اور مشتاق صدف نے اپنی منتخب شاعری پیش کی۔

تیسرے دن کے آخری اجلاس کی صدارت پروفیسر محمد حنیف کیفی نے کی اور شمیم طارق نے ''برصغیر کی معاصر اردو شاعری اور عصری مسائل'' اور شاہد پٹھان نے ''برصغیر کی معاصر اردو شاعری میں ولت رجحان'' پر مقالے پیش کیے۔ تمام اجلاسوں میں بحث ومباحثے اور سوال وجواب کا سلسلہ بھی چلا۔ آخر میں عنبر بہرائچی نے ساہتیہ اکادمی کی جانب سے تمام مقالہ نگاروں، مہمانوں اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

(ڈاک سے)

اردو مسلم کلچر تک محدود نہ رہیں

● بنگلور۔ 6 مارچ، کرناٹک اردو اکادمی بنگلور اور سنٹرل ساہتیہ اکادمی دہلی کی جانب سے بنگلور سنٹرل کالج کے سینٹ ہال میں منعقدہ تین روزہ کل ہند سیمینار برائے ہندوستانی ادب میں نئے رجحانات کے افتتاحی اجلاس میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے ملک کے نامور نقاد پروفیسر وارث علوی نے تلخ نوائی سے کام لیتے ہوئے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ اردو زبان جو ایک زمانہ دراز تک اس ملک کی تہذیب وتمدن یہاں کے سیاسی سماجی ماحول اور معاشرے کے لیے آکسیجن کا کام کرتی تھی اسے رفتہ رفتہ اب اردو کے ادیبوں نے صرف مسلم کلچر تک محدود کرکے رکھ دیا ہے۔ ایک زمانے میں اردو کا کوئی مذہب یا علاقہ نہ تھا اس زبان کے مایۂ ناز لکھنے والوں میں کرشن چندر، منشی پریم چند، اور راجندر سنگھ بیدی جیسے ادیب موجود تھے۔ یہاں مذہب کی قید نہیں تھی لیکن حالیہ دنوں میں جدھر دیکھو اردو صرف مسلم کلچر تک محدود ہوکر رہ گئی ہے اس کے لکھنے والوں میں بہت کم غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں کے نام سامنے آرہے ہیں۔ پروفیسر وارث علوی نے اپنے خطبے میں کہا کہ آج کنڑا، بنگالی، پنجابی، ملیالم، گجراتی ہر زبان کا یہی رونا ہے کہ اس کے پڑھنے والے کم ہوتے جارہے ہیں ایک اردو زبان کی ہی یہ حالت نہیں دیگر علاقائی زبانوں کا بھی یہی حال ہے۔ کرناٹک جیسے علاقے میں جہاں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں اور یہاں کی زبانیں دوسروں کو قریب لارہی ہیں وہیں کرناٹک کے اردو ادیبوں شاعروں میں ہمیں یہ کمی محسوس ہوتی ہے کہ اس میں کنڑا کلچر یا مقامی کلچر کی بوباس بہت کم نظر آتی ہے۔ یہاں کا اردو ادب صرف مسلم کلچر تک محدود ہوکر رہ گیا ہے۔ نعتیہ کلام، اسلامیات کی باتیں زیادہ ہورہی ہیں۔ ہر زبان کا ایک آنگن ہوتا ہے اور پچھواڑہ بھی۔ لیکن اردو زبان کا پچھواڑہ نہیں ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ملک بھر میں آج اردو کا مزاج شہری ہوگیا ہے اردو کے ہندو سکھ لکھنے والے ناپید ہوتے جارہے ہیں۔ دیہاتوں کے ماحول اور کلچر کا ذکر اردو ادب میں کم ہوتا جارہا ہے۔ ہمارے افسانوں، کہانیوں میں پہلے جو لطف ہوا کرتا تھا وہ کم ہوتا جارہا ہے۔ ہمیں کوئی بہتر نقاد نہیں ملتا جو معاشرے سے جڑا ہوا ہو۔ جدیدیت کے نام پر نیا رجحان جو آیا اس نے ادب کو ادب لطیف بنا دیا البتہ شاعری میں اچھے شاعر پیدا ہوگئے۔ اب مابعد جدیدیت کا زور ہے لیکن نہ تنقید پھل پھول سکی ہے، نہ ادب میں نئے ٹیلنٹس ہی پیدا ہوسکے ہیں۔ اس بامقصد سیمینار کے ذریعے کچھ نہیں تو آنند اور ترنگ کے ازلی سرچشموں کی تلاش کریں جو اقتدار کی مذہب کی چھوٹی سازشوں کا شکار ہوگئے ہیں۔ کرناٹک اردو اکادمی کے چیئرمین جناب خلیل مامون نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ بنگلور میں اردو اکادمی نے یہ کل ہند سیمینار اس مقصد کے تحت منعقد کیا کہ دیگر زبانوں

کے ادب میں کیا ہو رہا ہے اس سے آگہی حاصل کی جائے اور اردو ادب کو نکھارا جاسکے اس سیمینار میں کنڑا کے نامور شاعر نقاد و ادیب ایچ ایس شیو پرکاش کو مدعو کیا گیا ہے کہ ان کا انداز نظر اور ان کی شخصیت آزاد ہے وہ عالمی ادبی صورتحال پر روشنی ڈالیں گے۔ سیمینار کی پہلی نشست میں پروفیسر ایچ ایس شیو پرکاش نے ہندوستانی ادب کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی جبکہ ڈاکٹر شمیم حنفی نے اردو شاعری میں نئے رجحانات پر روشنی ڈالی۔ اردو اکادمی کے رجسٹرار پروفیسر یس محمد رحمت الحق نے خیر مقدم کیا۔ جناب عزیز اللہ بیگ رکن اکادمی نے مہمانوں کا تعارف کروایا۔ جناب اعظم شاہد نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ کثیر تعداد میں اردو شعرا، ادبا اور اداروں کے ذمے داران افتتاحی جلسے میں حاضر تھے۔ (سالار، بنگلور)

علی گڑھ تحریک کے احیا کی ضرورت

● علی گڑھ۔ 8 مارچ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اقلیتوں کی تعلیم کے موضوع پر دو روزہ قومی سیمینار کے اختتامی اجلاس میں ملک بھر سے تشریف لائے مندوبین نے غور وخوض کے بعد اتفاق رائے سے ایک قرارداد پیش کرتے ہوئے "علی گڑھ تحریک کا احیا" کرنے پر زور دیا جس کو اس ادارے کے بانی سرسید احمد خاں نے شروع کیا تھا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ترمیمی ایکٹ 1981 کے تحت ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی اور ثقافتی فروغ کی خصوصی ذمے داری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سپرد کی گئی ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر پی کے عبدالعزیز نے سیمینار کی تجاویز کو پیش کرتے ہوئے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ اپنی توانائی کو خود کو مکمل طور سے خواندہ اور باصلاحیت ملت میں تبدیل کرنے پر مرکوز کریں۔ ایک مناسب تعداد اعلیٰ اور پیشہ ورانہ تعلیم کے حصول میں مصروف ہوتا کہ وہ آئندہ قیادت کی ذمے داریاں بھی ادا کرسکیں۔ سیمینار میں اتر پردیش، بہار، مغربی بنگال اور آسام کی حکومتوں سے جہاں 55 فیصد سے زیادہ مسلم آبادی ہے، مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنے صوبوں میں کرناٹک، آندھرا پردیش اور کیرل کی طرح پالیسیاں اور اسکیمیں جاری کریں جو تمام طبقات کے لیے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے وسیع تر امکانات کا ذریعہ ہوں جس میں پیشہ ورانہ تعلیم بھی شامل ہوتا کہ اس سیکٹر میں معیشت کی رفتار کو تیز کرنے کے لیے تمام لوگوں کی مساوی حصہ داری یقینی بنائی جاسکے۔

سیمینار میں کہا گیا کہ یہ ضروری ہے کہ آئین کی دفعہ (1)30 کے معانی اور انسلاکات پر مبنی قانون سازی کی جائے۔ اس قسم کی قانون سازی میں اقلیت، اسٹیبلشمنٹ، ایڈمنسٹریشن وغیرہ کی اصطلاحات کے معنی واضح کیے جائیں اور اقلیتی کردار، پرنسپل اور اساتذہ کی تقرری کا حق، طلبہ کے داخلے، ان کی پسند کے ادارے وغیرہ جیسی اصطلاحات کی خصوصی طور سے وضاحت ہو۔ اس سے اقلیتی حقوق سے متعلق معاملات میں مسلسل قانونی کارروائیوں کا سد باب ہوجائے گا۔ اوقاف کے سلسلے میں جوائنٹ پارلیامنٹری کمیٹی کی رپورٹ کی روشنی میں اس سیمینار میں مسلمانوں سے "وقف تحریک" چلانے کا مطالبہ بھی کیا گیا تاکہ وقف جائیداوں کو افراد، غیر سرکاری تنظیموں نیز صوبائی و مرکزی حکومتوں کے غیر قانونی قبضے سے نجات دلائی جاسکے۔ پرائمری جونیئر اور سیکنڈری اسکولوں کے قیام، حکومت کی فلاحی اسکیموں سے مسلمانوں کو فائدہ اٹھانے او راتر پردیش، بہار، مغربی بنگال اور آسام میں کم سے کم پانچ یونیورسٹیاں قائم کرنے کی بھی مسلمانوں سے اپیل کی گئی۔ اس سیمینار کے انعقاد کے لیے وائس چانسلر پروفیسر پی کے عبدالعزیز کی کوششوں کو سراہتے ہوئے کہا گیا کہ انھوں نے اس سیمینار کا اہتمام کرکے ایک اہم فریضہ انجام دیا ہے۔ ساتھ ہی قرار داد کا مسودہ تیار کرنے میں دلی اقلیتی کمیشن کے صدر مسٹر کمال فاروقی، جناب کے کے ابوبکر، مسٹر مقبول احمد سراج، ڈاکٹر فخرالدین محمد اور ایڈووکیٹ مسٹر وی کے بیرن کی خدمات کو سراہا گیا۔ ممتاز عالم دین مولانا ولی رحمانی نے افتتاحی جلسے میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کرتے ہوئے کہا کہ اقلیتوں کی فلاح و بہبود سے متعلق جو بھی منصوبے بنائے جاتے ہیں ان پر عمل نہیں ہوتا۔ اس کی باقاعدہ مانیٹرنگ ہونی چاہیے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار پروفیسر وی کے عبدالجلیل نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

مجاز — فن اور شخصیت

● چنڈی گڑھ۔ ہریانہ اردو اکادمی کی جانب سے 2 اور 3 مارچ 2009 کو مجاز پر دو روزہ سیمینار کا افتتاح ڈاکٹر اے آر قدوائی، گورنر ہریانہ نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ مجاز نوجوانوں کے شاعر ہیں۔ یعنی وہ ہندوستانی نوجوانوں کو انقلاب کا پیغام دینا چاہتے ہیں۔ انھوں نے مجاز کے کلام کو عوام الناس تک پہنچانے پر زور دیا۔ مہمانِ خصوصی کے طور پر جناب مانگے رام گپتا، وزیر تعلیم ہریانہ نے شرکت کی۔ تعارفی کلمات جناب کشمیری لال ذاکر سکریٹری ہریانہ اردو اکادمی نے ادا کیے۔ افتتاحیہ اجلاس کے دوران ڈاکٹر اے آر قدوائی اور جناب مانگے رام گپتا، کے دستِ مبارک سے تین کتابوں کی رسمِ اجرا عمل میں آئی۔ جن میں ہریانہ اردو اکادمی کا خبرنامہ، محترمہ امن دیپ کا شعری مجموعہ "احساس اور بندگی" اور ادم پرکاش شرما غافل کا شعری مجموعہ "دیوانِ غافل" شامل ہیں۔ اس موقع پر مجاز کی مشہور نظم "نوجوان خاتون سے" ڈاکٹر روبینہ شبنم نے پیش کی۔ جناب ایس سی چودھری (آئی اے ایس) نے سیمینار میں

تشریف لائے سبھی شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ مہمانِ خصوصی مجاز کی بھتیجی محترمہ صہبا لیاقت علی نے اپنے چچا کے حوالے سے منظوم تاثرات کا اظہار کیا۔ بعد ازاں پروفیسر شارب ردولوی نے اپنا کلیدی خطبہ پڑھا۔ جس میں انھوں نے مجاز کی شخصیت اور فن پر تفصیل سے روشنی ڈالی انھوں نے کہا کہ مجاز کی خوبی یہ ہے کہ وہ تلخ بات بھی بڑی شائستگی سے کرتے ہیں۔ مجاز کے یہاں زبان کو برتنے کا ایک خاص سلیقہ ہے وہ پُرشور الفاظ اور تراکیب سے گریز کرتے ہیں۔

پہلے اجلاس کی مجلسِ صدارت پروفیسر شمیم نکہت، پروفیسر شارب ردولوی اور احمد ابراہیم علوی پر مشتمل تھی اور نظامت کے فرائض محترمہ وسیم راشد صاحبہ نے ادا کیے۔ اس اجلاس میں پڑھا جانے والا پہلا مقالہ محترمہ روبینہ شبنم کا بعنوان ''مجاز بر سبیلِ تذکرہ'' تھا۔ موصوفہ نے مجاز کے یوم ولادت سے متعلق ناقدین کی مختلف آرا کا ذکر کیا۔ صحیح تاریخ پر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ دوسرا مقالہ ہندی کے ناقد ڈاکٹر سبھاش رستوگی نے پڑھا۔ تیسرا مقالہ جناب نندکشور وکرم کا بعنوان ''موت یا خودکشی'' تھا۔ چوتھا مقالہ بعنوان ''عام انسان تھا ہی نہیں'' جناب فاروق ارگلی کا تھا۔ پانچواں مقالہ ڈاکٹر دیپک نندن کا تھا۔ چھٹا مقالہ محترمہ صہبا لیاقت علی صاحبہ کا بعنوان ''مجاز اور ان کا خاندان'' تھا۔

سیمینار کے دوسرے روز کا پہلا اجلاس صبح دس بجے سے دوپہر ایک بجے تک جاری رہا جس کی مجلسِ صدارت میں محترمہ صہبا لیاقت علی، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اور سبھاش رستوگی شامل تھے۔ جبکہ نظامت کے فرائض محترمہ فرحت رضوی نے انجام دیے۔ اس اجلاس کا پہلا مقالہ ہندی کے نقاد ڈاکٹر رتن مصور کا بعنوان ''مجاز کی کویتا میں استری چنتن'' دوسرا مقالہ محمد مستمر کا بعنوان ''مجاز کی شعری جہتیں'' تیسرا مقالہ ڈاکٹر خالد علوی کا بعنوان ''مجاز ایک جائزہ'' چوتھا مقالہ محترمہ صہبا لیاقت علی صاحبہ کا بعنوان ''عشقِ مجازی'' پانچواں مقالہ محترمہ فرحت رضوی کا ''مجاز ایک اسرار'' چھٹا مقالہ پروفیسر کملیش موہن کا بعنوان ''مجاز کا نفسیاتی تجزیہ'' ساتواں مقالہ احمد ابراہیم علوی کا بعنوان ''مجاز ایک سرسری جائزہ'' آٹھواں مقالہ کشمیری لال ذاکر کا بعنوان ''مجاز شاعرِ محفلِ وفا اور مطربِ بزمِ دلبراں'' اور آخری مقالہ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کا بعنوان ''عصرِ حاضر کا شاعر مجاز'' تھا۔ بعد ازاں پروفیسر شارب ردولوی نے مقالات پر اپنی مبصرانہ رائے کا اظہار فرمایا اور پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے مجموعی تاثرات پیش کیے۔

اختتامی اجلاس کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر خالد علوی نے انجام دیے۔ اور اختتامی خطبہ ابراہیم علوی نے پیش کیا۔ جو سفارشات پیش کی گئیں وہ مندرجہ ذیل ہیں، مجاز کے غیر مطبوعہ کلام کی اشاعت، 2011 میں مجاز کا صد سالہ جشن، کسی یونیورسٹی میں پروفیسر کی پوسٹ کے لیے مجاز کے نام پر چیئر شپ، مختلف مقامات پر مجاز پر توسیعی خطبے اور سیمینار۔ (ڈاک سے)

قرۃالعین حیدر پر سیمینار

● بجنور۔ ضلع کی معروف، تعلیمی، ثقافتی، تہذیبی تنظیم ''منڈلیئے وکاس سنستھان''، کے زیر انتظام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے'' اردو افسانے کو قرۃالعین حیدر کی دین'' کے موضوع پر ایک روزہ سیمینار رحمانیہ گرلس انٹر کالج، چاندپور، میں منعقد کیا گیا۔ سیمینار میں ضلع کی ادبی، علمی، دینی، سماجی شخصیات کے علاوہ ضلع کے تمام شہروں اور دیہی علاقوں سے ڈگری کالج میں زیرِ تعلیم طلبہ نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ سیمینار صبح 10 بجے شروع ہوکر شام 5 بجے تک کامیابی سے چلا۔ اردو زبان کی آبیاری میں ضلع بجنور کا نمایاں حصہ رہا ہے۔ اس خطے نے حضرت قائم چاندپوری علامہ تاجور نجیب آبادی، ڈپٹی نذیر احمد، ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری، قرۃالعین حیدر کے والدین جناب سجاد حیدر یلدرم، محترمہ نظر سجاد یلدرم، اخترالایمان، نشتر خانقاہی، ڈاکٹر گیان چند جین جیسے باکمال ادیب اردو زبان کو دیے ہیں وہیں بجنور ضلع کے قصبہ نہٹور میں 20 جنوری 1927 کو جنم لینے والی محترمہ قرۃالعین حیدر اردو ادب کی وہ ہستی تھیں جو بین الاقوامی طور پر پہچانی جاتی تھیں۔

سیمینار کا افتتاح دہلی یونیورسٹی کے ڈاکٹر خالد علوی نے کیا، پہلی نشست کی صدارت کے فرائض پروفیسر ڈاکٹر لبنیٰ حامد صاحبہ، پرنسپل نایاب عباسی گرلس ڈگری کالج امروہہ نے انجام دیے اور نظامت سیمینار کے کنوینر الیاس انجم نے کی۔ ڈاکٹر خالد علوی نے اپنے افتتاحیہ کلمات میں مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ یہاں وہ مہمان نہیں بلکہ سرزمین قائم چاندپوری سے تعلق رکھنے پر میزبان بھی ہیں۔ انھوں نے قرۃالعین حیدر پر سیمینار منعقد کرانے پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی اور سیمینار کے کنوینر الیاس انجم صاحب کو مبارک باد پیش کی۔ انھوں نے کہا کہ قرۃالعین حیدر آج ہمارے درمیان نہیں ہیں، لیکن ان کی باوقار شخصیت پورے عصری ادبی منظرنامے پر اس طرح حاوی تھی، کہ وہ اب نہیں ہیں تو یہ منظر ادھورا-ادھورا سا لگتا ہے، وہ ایک کثیرالجہت ادیبہ تھیں، ان کی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے ہوا، پھر وہ ناول نگاری کی طرف آئیں اور ''آگ کا دریا'' جیسا لازوال ناول لکھا۔ قرۃالعین حیدر سا قد وقامت اور ان جیسے کمالات رکھنے والے تخلیق کار کسی بھی زبان میں صدیوں میں جنم لیتے ہیں۔ اردو زبان کو ہمیشہ ان کے تخلیقی ورثے پر ناز رہے گا۔

علی گڑھ سے تشریف لائی ڈاکٹر افشاں ملک نے ''قرۃالعین حیدر-ایک لی جنڈ افسانہ نگار'' کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔ محترمہ وسیم راشد نے ''قرۃالعین حیدر- ایک جائزہ'' کے عنوان سے اور ڈاکٹر افسر علی نے ''اردو افسانہ اور قرۃالعین حیدر'' کے عنوان سے اپنے مقالے پڑھے ڈاکٹر عبدالحق انجم نے

"قرۃ العین حیدر- اردو افسانہ اور قومی یکجہتی" کے عنوان سے اپنا مقالہ پڑھا۔

ممبئی سے تشریف لائے سراج انصاری نے کہا کہ قرۃ العین حیدر اردو زبان کی نہیں، پوری ادبی دنیا کی بڑی قلمکار ہیں۔ قمر قدیر ارم کے مقالے کا عنوان تھا "اردو افسانے کو قرۃ العین حیدر کی دین" سیمینار کی دوسری نشست کی صدارت کے فرائض نگر پالیکا پریشد چاند پور کی سابق چیر پرسن محترمہ شاداب انجم نے اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر عبدالحق انجم نے انجام دیے۔

محمد احمد دانش نے "قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں تہذیبی و تاریخی عمل کی امیجری" کے عنوان سے اپنا مقالہ پڑھا اور کہا کہ، "عینی آپا کی تحریروں میں پوری انسانی تاریخ کی معنی خیز جھلکیاں دیکھی جاسکتی ہیں، ان کا فنکارانہ کمال یہ ہے کہ انفرادی حوالے بھی ان کے یہاں اجتماعی بن جاتے ہیں، وہ آپ بیتی بھی بیان کریں تو جگ بیتی معلوم ہوتی ہے۔ جبل پور سے تشریف لائے محمد رضوان انصاری نے اپنے مقالے میں کہا کہ اردو فکشن کے موجودہ عہد کو بجا طور پر قرۃ العین حیدر کا عہد کہا جاسکتا ہے۔ محترمہ شبنم راہی نے کہا کہ قرۃ العین حیدر اپنے آپ میں ایک دبستاں اور تخلیقی ادب کے ایک عظیم الشان عہد کی نمائندہ تھیں۔ معروف افسانہ نگار ذاکر فیضی نے کہا عینی آپا کی تحریروں میں اتنے زیادہ خطے اور زندگی کی اتنی سطحیں تھیں کہ ظاہر ہوتا ہے ان کی واقفیت ہندوستان سے ہی نہیں بلکہ پوری دنیا سے بہت گہری تھی۔ مقبول شاعر شکیل جمالی نے کہا عینی آپا شروع سے آخر تک اپنی تخلیقی سرگرمیوں میں بہت کمیاب خود اعتمادی اور خود نگاہی اور خود کفالتی سے کام لیتی رہیں، ڈاکٹر لئیق حامد صاحبہ نے کہا کہ قرۃ العین حیدر کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ کبھی ماضی قریب اور کبھی ماضی بعید کو اپنی تحریروں میں پوری طرح زندہ کر دیتی تھیں، بعض اوقات تو پڑھنے والے کو گمان گزرنے لگتا ہے کہ افسانہ نگار بھی اسی زمانے کا فرد ہے، جس زمانے کی وہ داستاں بیان کر رہا ہے۔

ڈاکٹر لئیق حامد صاحبہ نے الیاس انجم کنوینر سیمینار و قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کو بطور خاص مبارک باد دی اور شکریہ ادا کیا اور کہا کسی بھی زبان کی ترقی کی ذمہ داری اس زبان کے بولنے والوں پر زیادہ ہوتی ہے۔ اردو کی ترقی اس وجہ سے بھی عزیز ہونی چاہئے کہ یہ ہم سب کی مادری زبان ہے۔

محترمہ شاداب انجم نے کہا کہ یہ خوشی کا مقام ہے کہ چاند پور شہر کی طالبات نے بھی اس سیمینار میں جوش و خروش سے حصہ لیا اور ان کا اتنی بڑی تعداد میں یہاں آنا اردو زبان کے تابناک مستقبل کی ضمانت ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کو مین مضمون بنا کر آئی اے ایس کے امتحان میں شریک ہوں انشاء اللہ وسیم الحق (آئی۔اے۔ایس) کی طرح ضرور کامیاب ہونگے۔

اس موقع پر سترھویں صدی کے عظیم شاعر حضرت قائم چاند پوری پر خالد علوی کی کتابوں "مثنویات قائم" اور "قائم چاند پوری" کا اجرا بھی عمل میں آیا۔

سیمینار میں جناب کیرتی ورما، سبھاش جاوا، ڈاکٹر منیر خالد، حاجی نسیم الدین، ڈاکٹر پرویز، سید وزیر حیدر زیدی، ڈاکٹر عالی قریشی، اسجد مثل، (مولانا) محمد اسلم انصاری، ڈاکٹر نسیم انصاری، شاہد مجاز، بابو تنویر احمد، ڈاکٹر ارشاد علی، فیروز بخت افروز، اجمال احمد، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے ذریعے چلائے جارہے اسکائی لائن انسٹی ٹیوٹ آف کمپیوٹر کے انسٹرکٹر عیاض الاعجاز اور نسیم احمد کے علاوہ روبینہ، زینت، حنا، ارم، عنبرین، سعدیہ انجم، ثمینہ خان ایڈوکیٹ، زیبا نسیم ڈاکٹر منور حسین، اجمال احمد، فہد انجم نے بھی قرۃ العین حیدر پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ (ڈاک سے)

ٹیگور، نذرل اور اقبال پر سیمینار

● کولکاتا۔ مسلم انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام 28-27 فروری 2009 کو ٹیگور، نذرل اور اقبال پر دو روزہ قومی سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ 27 فروری 2009 کو پہلے اجلاس میں ٹیگور کے فن اور شخصیت پر چار مقالے پڑھے گئے۔ اس موقع پر ناظم جلسہ نعیم انیس نے کہا کہ ٹیگور، نذرل اور اقبال کا شمار ہمارے ان عظیم شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی شاعری کو عالم انسانیت کی بقا کے لیے وقف کرتے ہوئے اتحاد و اتفاق کا درس دیا۔ اس سیمینار کا مقصد یہی ہے کہ ہم نئی نسل کو ان شعرا کے افکار و خیالات سے واقف کرائیں۔

ڈاکٹر محمد کاظم (دہلی یونیورسٹی) نے ربندر ناتھ ٹیگور کے ڈراموں کا جائزہ لیا۔ جیوتیکا پانڈے نے بھی ٹیگور کے ڈراموں پر بنگلہ میں مقالہ پڑھا۔ پروفیسر گوتم باسو نے جھانسی کی رانی پر تجزیاتی گفتگو کی جب کہ ڈاکٹر نندنی بھٹا چاریہ نے ٹیگور کے ناول "گورا" کا تنقیدی جائزہ اپنے مقالے میں پیش کیا۔ اس اجلاس کی صدارت ڈاکٹر شہناز نبی، صدر شعبۂ اردو، کلکتہ یونیورسٹی نے کی انھوں نے چاروں مقالوں پر تبصرہ کرتے ہوئے مسلم انسٹی ٹیوٹ کو مبارک باد پیش کی کہ اس ادارے نے ایک اہم سیمینار کا انعقاد کر کے اردو والوں کو ٹیگور اور نذرل کے خیالات سے واقف کرانے کی کامیاب کوشش کی۔

دوسرے اجلاس میں قاضی نذر الاسلام کی شاعری اور حیات پر چار مقالے پڑھے گئے۔ اس اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے ڈاکٹر رگھوناتھ دتا نے نذر الاسلام کی شاعری اور حیات کا بہت خوب صورتی کے ساتھ اپنی تقریر میں احاطہ کیا۔ ڈاکٹر ارشاد نیر نے نذر الاسلام کی نظم "باغی" کی روشنی میں ان کی انقلابی شاعری پر روشنی ڈالی۔ محمد ارشاد عالم بصری نے قاضی نذر الاسلام کی شاعری میں باغیانہ عناصر کا جائزہ لیا۔ پروفیسر رونا ایک بھٹاچاریہ نے قاضی نذر الاسلام کی مختصر کہانیوں پر تفصیلی

گفتگو کی جب کہ مصطفیٰ اکبر نے نذرل کی رومانی اور انقلابی شاعری پر مدلل بحث کی۔ جلسے کی صدر مسز دیپا کھوپادھیائے نے اپنی تقریر میں تمام مقالوں کی ستائش کرتے ہوئے نذرل کی عظمت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ میں اپنے بچپن میں بھاگ بھاگ کر نذرل کو دیکھنے جایا کرتی تھی اور ان کی ایک جھلک پا کر مجھے ایسا لگتا تھا کہ سارے جہان کی خوشیاں مل گئی ہوں۔

سیمینار کے دوسرے روز 28 فروری کو اقبال کی حیات وخدمات پر دو اجلاس میں مقالے پڑھے گئے۔ پہلے اجلاس میں ڈاکٹر محمود عالم نے اقبال کے فلسفۂ خودی پر انگریزی میں مقالہ پڑھا اور اقبال کے فارسی مجموعۂ کلام "اسرار خودی" کے حوالے سے بحث کی۔ جاوید رحمانی نے "اقبال تنقید ایک بازدید" کے عنوان سے اپنا مقالہ پڑھا جس سے تحقیق کے نئے در وا ہوئے۔ کلیم حاذق نے اقبال اور نئے ہزارے کا چیلنج کے عنوان سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اقبال نہ صرف اپنے عہد بلکہ آئندہ کئی صدیوں تک یاد رکھے جانے کے لائق ہیں۔ پروفیسر محمد سلیمان خورشید نے اقبال کے یہاں تصور معاشرت کے حوالے سے مقالہ پڑھا۔ صدر اجلاس جناب قیصر شمیم نے اپنی تقریر میں کہا کہ جو کچھ مجھے یہاں عرض کرنا تھا، سچ پوچھیے تو وہ ساری باتیں بحث میں حصہ لینے والوں نے کہہ ڈالیں۔ اب میرے لیے کہنے کو کچھ بچا ہی نہیں۔ اتنا ضرور کہوں گا کہ اس جلسے میں اقبال کے حوالے سے فکر انگیز مقالے پڑھے گئے جن سے میری معلومات میں بھی بیش بہا اضافہ ہوا۔ یہاں جو مباحث ہوئے، جو سوالات اٹھائے گئے وہ اس سیمینار کی کامیابی کا ثبوت ہیں۔ میں تمام مقالہ نگاروں کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

چوتھے اور آخری اجلاس میں تابش عبیداللہ خان نے اپنے مقالے میں فکرِ اقبال پر الہلال کے اثرات کی نشان دہی کی۔ شاہد اقبال نے اقبال کے فلسفۂ عشق پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے نئے زاویوں سے روشنی ڈالی۔ محمد شمشیر عالم نے کلامِ اقبال کے فلسفۂ عشق پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے نئے زاویوں سے روشنی ڈالی۔ محمد شمشیر عالم نے کلام اقبال کے مختلف رنگوں کا مختصر جائزہ لیا۔ ابوذر ہاشمی نے "اقبال شناسی کچھ منتشر خیالات" کے عنوان سے بحث کرتے ہوئے اقبال کی شاعری کے نئے گوشوں پر روشنی ڈالی۔ سامعین نے مقالوں کے حوالوں سے کچھ سوال بھی کیے جن کے فاضل مقالہ نگاروں نے اطمینان بخش جواب دیے۔ جلسے کے صدر پروفیسر سلیمان خورشید نے تمام مقالوں پر بحث کرتے ہوئے کہا مقالہ نگار مقالوں میں اپنا مطمحِ نظر پیش کرتا ہے اور کوئی ضروری نہیں کہ مقالہ نگار اور سامعین کے خیالات یکساں ہوں۔ اس لیے سیمینار کی اصل اہمیت اس وقت واضح ہوتی ہے جب سیمینار میں مباحث ہوں۔ سیمینار کے کنوینر نعیم انیس نے یونیورسٹی، کالج اور اسکولوں کے اساتذہ، طلبہ اور طالبات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اپنی شرکت سے اس سیمینار کو کامیابی سے ہم کنار کیا۔ (ڈاک سے)

فکشن کا مطالعہ آزادانہ ذہن سے کریں

● کولکاتا۔ 5 مارچ 2009، وکٹوریہ کالج، کلکتہ میں آزادی کے بعد اردو فکشن کے موضوع پر ایک سیمینار منعقد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر شمیم انور نے کی اور مہمانِ خصوصی ڈاکٹر علی جاوید تھے جبکہ مہمانانِ ذی وقار کی حیثیت سے ڈاکٹر محمد کاظم اور جناب جاوید رحمانی نے شرکت کی۔ اس کالج کی پرنسپل نے مہمانان کا استقبال کیا۔ سیمینار میں ایک کتاب "بنگال کا اردو ادب" کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ سیمینار کا آغاز محترمہ فرحت آرا کے مضمون "کرشن چندر کی افسانہ نگاری" سے ہوا جس میں انھوں نے ہندوستان میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے سلسلے میں کرشن چندر کی خدمات کا جائزہ لیا۔ ان کے بعد جناب جاوید رحمانی نے اردو فکشن کی تنقید کے موضوع پر اظہار خیال کیا جس میں انھوں نے فکشن کی تفہیم میں سکّہ بند نقادوں کی تحریروں کے مقابلے میں ان تحریروں کو زیادہ اہم بتایا جو خود فکشن رائٹرز نے لکھی ہیں انھوں نے کہا کہ یہ صورت حال ابتدا سے تھی اور اب بھی قائم ہے دورِ حاضر میں اردو فکشن کے زوال کا ذمے دار انھوں نے نقادوں کو ٹھہرایا اور کہا کہ فکشن کے نقادوں نے فکشن رائٹرز کو ادب اور زندگی دونوں کے شعور اور ڈسپلین سے بیگانہ کر دیا ہے۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ اگر ہم فکشن کے نقادوں پر بھروسہ کرتے ہیں تو فکشن کی تفہیم کا سرا ہاتھوں سے جاتا رہتا ہے چنانچہ ہر طالب علم کو اردو فکشن کا آزادانہ مطالعہ کرنا چاہیے۔ ان کے بعد جناب شاہد اختر نے بنگال کے افسانہ نگار اظہار الاسلام کی افسانہ نگاری پر مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے بھی جناب جاوید رحمانی کے خیالات کی تائید کی۔ ان کے بعد ڈاکٹر محمد کاظم نے اپنے مقالے میں اردو فکشن کے ارتقا پر روشنی ڈالی اور ابتدا سے حال تک کے میلانات کا جائزہ بھی لیا۔ انھوں نے کہا کہ جناب جاوید رحمانی کا یہ کہنا درست ہے کہ افسانوی ادب کی تنقید اردو میں اطمینان بخش نہیں ہے۔ ان کے بعد پروفیسر شمیم انور نے اپنے مقالے میں آزادی کے بعد کے افسانوی ادب کے مختلف زاویوں پر روشنی ڈالی اور افسانوی ادب کے ساتھ نقادوں کی زیادتی کا نوحہ پڑھا۔ انھوں نے بتایا کہ افسانہ نگار اچھے افسانے لکھتے رہے ہیں مگر نقادوں نے اچھے تجزیے نہیں کیے۔ ان کے بعد جلسے کے مہمانِ خصوصی ڈاکٹر علی جاوید نے اپنی تقریر میں جناب جاوید رحمانی کی شکایتوں کا ذکر کرتے ہوئے انھیں درست بتایا اور کہا کہ فکشن رائٹرز کے ساتھ فکشن کے نقادوں کے ظلم کی داستان بہت پرانی ہے جیسا کہ ان مثالوں سے ظاہر ہے جو جاوید رحمانی نے پیش کیں۔ ڈاکٹر علی

جاوید نے اس سلسلے میں منٹو کے افسانوں پر سردار جعفری کے اعتراضات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ سردار جعفری کے ان خیالات کو وقت نے رد کر دیا اور منٹو کے افسانے اب بھی تر و تازہ ہیں۔ انھوں نے قمر رئیس اور جعفر رضا وغیرہ کی تنقیدوں کو فکشن اور پریم چند کی تفہیم کے راستے کی رکاوٹ بتایا اور طلبہ سے کہا کہ وہ فکشن کا مطالعہ آزاد ذہن سے کریں، ان نقادوں کی مدد سے نہیں۔ ان کے بعد وکٹوریہ کالج میں اردو کی لکچرر محترمہ فریدہ انور نے تمام مہمانان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ یہ سیمینار اردو فکشن کے پورے سرمائے کی نئی تفہیم اور تعبیر کے راستے کھولے گا۔ (ڈاک سے)

دینی مدارس میں عصری تعلیم وقت کا تقاضا

● اردو مجلس حیدرآباد کے زیر اہتمام ایک ادبی اجلاس اور مشاعرہ منعقد ہوا۔ ادبی اجلاس کی صدارت الحاج سید شاہ مصطفی حسین بخاری چیئرمین مدینہ انجینئرنگ کالج کڑپہ نے کی۔ مولانا سید عثمان پاشاہ قادری پرنسپل دارالعلوم لطیفیہ ویلور نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ ڈاکٹر سید اسلام الدین مجاہد، پروفیسر مجید بیدار، پروفیسر بشیرالحق قریشی نے ''دینی مدارس میں عصری تعلیم کے تقاضے'' کے زیر عنوان اپنے مضامین پیش کیے۔ ڈاکٹر سید منیر محی الدین قادری کے تحقیقی مقالے ''دارالعلوم لطیفیہ ویلور کی علمی و ادبی خدمات'' کی رسم اجرا سید شاہ مصطفی حسین بخاری کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ جناب قدیر انصاری نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ ڈاکٹر اسلام الدین مجاہد نے اپنے مضمون میں کہا کہ دور حاضر میں دینی مدارس کی وہی اہمیت ہے جو قرن اول میں تھی۔ بلکہ حالات کی سنگینی اس بات کی متقاضی ہے کہ گاؤں گاؤں قریہ قریہ دینی مدارس اور دینی جامعات قائم ہوں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان دینی دانش گاہوں کے ذمے داروں کو اس حقیقت کا بھی ادراک ہونا چاہیے کہ ہمارے دینی مدارس زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کا بھی مقابلہ کرسکیں۔ اس کے لیے عصری تقاضوں سے آگاہی ضروری ہے اور یہ تبھی ممکن ہے جبکہ دینی مدارس عصری تعلیم پر بھی توجہ مرکوز کریں۔ پروفیسر مجید بیدار نے اپنی تقریر میں کہا کہ دینی مدارس کے نصاب میں تبدیلی لانی پڑے گی۔ علما کو ہمارے حل طلب مسائل کا حل نکالنا چاہیے۔ مولانا سید عثمان پاشاہ قادری نے دارالعلوم لطیفیہ کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ دارالعلوم کا مقصد یہ ہے کہ یہاں دینی طلبہ تیار کریں۔ حافظ اور عالم تیار کرنا ہمارا مقصد ہے۔ پروفیسر بشیرالحق قریشی نے ڈاکٹر سید منیر محی الدین قادری کے تحقیقی مقالے ''دارالعلوم لطیفیہ ویلور کی علمی و ادبی خدمات'' کے جائزے میں کہا کہ مقالہ بہت ہی سہل اور سادہ اسلوب میں تحریر کیا گیا ہے۔ صدر اردو مجلس پروفیسر رحمت یوسف زئی نے دینی مدارس میں عصری علوم کی اہمیت اور ضرورت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ دینی مدارس کے طلبہ کو جدید اور تازہ بہ تازہ معلومات ہونا ضروری ہے تاکہ زمانے کا ساتھ دے سکیں۔ صدر ادبی اجلاس سید شاہ مصطفی حسین بخاری نے اپنی بصیرت افروز تقریر میں کہا کہ دینی مدارس میں جو طلبہ علم دین کے علاوہ انگریزی سیکھنا چاہتے ہیں ان کے لیے اس کا انتظام کرنا چاہیے۔ متعدد زبانوں کا سیکھنا اور ان میں کمال پیدا کرنا بھی کمال انسانی ہے۔ دینی علوم کے ساتھ دنیاوی علوم حاصل کرنا ضروری ہے تاکہ غیروں کے حملوں کا دفاع کیا جاسکے۔ آج کے دور میں عصری تعلیم کی سخت ضرورت ہے۔ ہماری اولاد کو دینی علوم کے ساتھ دنیاوی علوم جاننا ضروری ہے۔ آخر میں جناب مضطر مجاز کی صدارت میں مشاعرہ منعقد ہوا۔ جناب قدیر انصاری نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ مشاعرے میں صدر مشاعرہ کے علاوہ پروفیسر رحمت یوسف زئی، ڈاکٹر محسن جلگانوی، قدیر انصاری، عبدالغفار خداداد، فرید سحر، ڈاکٹر طیب پاشاہ قادری، شکیل احمد (کڈپہ)، ستار فیضی (کڑپہ)، ڈاکٹر سید منیر محی الدین قادری، خواجہ فریدالدین صادق، ایوب نصرت نے کلام سنایا۔ جناب رحیم خاں کے شکریے پر یہ محفل رات دیر گئے اختتام کو پہنچی۔ (ڈاک سے)

اردو اخبارات پر بہتان تراشی کی مذمت

● نئی دہلی۔ 10 مارچ، آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس نے اردو اخبارات پر فرقہ پرستی اور جانبداری کے الزامات کی پرزور مذمت کی ہے اور دہشت گردی اور ہندوستانی میڈیا کے موضوع پر انگریزی اور ہندی میں شائع ہونے والی تازہ ترین کتاب پر اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا ہے کہ دراصل یہ کتاب آر ایس ایس کے ایک دماغ راکیش سنہا نے ترتیب دی ہے جو اپنی مسلم مخالف ذہنیت کے لیے بدنام ہیں۔ پچھلے روز اس کتاب کا اجرا کرتے ہوئے سی بی آئی کے سابق ڈائرکٹر جوگندر سنگھ نے مبینہ طور پر یہ کہتے ہوئے اردو اخباروں کو نشانہ بنایا تھا کہ دہشت گردانہ حملوں کے سلسلے میں اردو میڈیا کا جانبدارانہ رویہ ملک کے مفاد میں نہیں ہے۔ پروفیسر سنہا کا بھی یہی کہنا ہے کہ تقریباً 25 اخبارات کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اردو میڈیا دہشت گردی کے معاملے میں کتنا فرقہ پرست ہے۔ کانفرنس کے سکریٹری معصوم مرادآبادی نے کتاب کے مرتب کے اس بیان پر شدید اعتراض کیا ہے جس میں کہا گیا تھا کہ اردو صحافت ایک خاص مذہب کی صحافت بن گئی ہے۔ واضح رہے کہ اس کتاب میں اردو اخبار نویسی کو ایک سازشی صحافت سے تشبیہ دی گئی ہے اور اس میں دہلی، ممبئی، حیدرآباد اور لکھنؤ سے شائع ہونے والے روزناموں کی رپورٹنگ، مضامین اور اداریوں پر سخت تنقید کی گئی ہے سیاست (حیدرآباد)،

اردو ٹائمز (ممبئی)، جدید مرکز (لکھنؤ) کے علاوہ دہلی کے مقبول عام اخبارات دعوت، نئی دنیا، راشٹریہ سہارا، جدید خبر، صحافت اور ہندوستان ایکسپریس کو خاص طور پر نشانہ بنایا گیا ہے۔ 155 صفحات پر مشتمل اس کتاب میں 60 سے زیادہ صفحات اردو اخبارات کے لیے صرف کیے گئے ہیں۔ باقی صفحات میں انگریزی اور ہندی اخبارات کی بے باک اور غیر جانبدارانہ رپورٹنگ پر بحث کی گئی ہے۔ (ہندوستان ایکسپریس، نئی دہلی)

اردو والے ہی اردو کو نقصان پہنچا رہے ہیں

● نئی دہلی۔ 21 مارچ، اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کی سالانہ جائزہ میٹنگ کا انعقاد ابوالفضل انکلیو میں ہوا، جس کی صدارت ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن خاں نے کی۔ اس موقع پر تنظیم کی جانب سے فروغ اردو کے سلسلے میں اٹھائے گئے اقدامات کا جائزہ، مرکزی حکومت اور صوبائی حکومتوں خصوصاً دہلی، اتر پردیش، بہار اور مہاراشٹر میں اردو کی صورت حال پر صوبائی صدور کی رپورٹوں کا جائزہ لیا گیا۔ اردو کی ناگفتہ بہ حالت بہار اور اتر پردیش میں سب سے زیادہ پائی گئی۔ یہاں حکومت سے زیادہ خود اردو کی روٹیاں کھانے والے اپنے ذاتی مفاد اور خودغرضی میں اردو کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ تنظیم کے جنرل سکریٹری نے کہا کہ عوامی سطح پر مظفر نگر کے علاوہ کہیں بھی اردو کا عوامی استعمال نہیں کیا جارہا ہے۔ انھوں نے دیوبند یونانی میڈیکل کالج کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ یہاں کے مسلم ادارے عام طور سے اپنے بینروں اور پوسٹروں میں صرف ہندی ہی استعمال کرتے ہیں۔ ڈاکٹر لال بہادر نے غیرت دلاتے ہوئے کہا کہ شمالی ہندوستان کے ہندوؤں نے ہندی کو مضبوطی سے تھام کر رکھا ہے جب کہ مسلمان اس معاملے میں انتہائی بے اعتنائی کا شکار ہیں۔ اس موقع پر ''ہم اردو کیسے پڑھیں'' کے عنوان سے غالب ایجوکیشنل سوسائٹی کے قومی جنرل سکریٹری حکیم محمد طارق امروہوی نے اپنا مقالہ پیش کیا۔ اردو پڑھنے اور پڑھانے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے روزگار کے مواقع کے بارے میں روشنی ڈالی۔ اس موقع پر اتفاق رائے سے قرارداد منظور کی گئی کہ ملک کے سیکولر کردار اور گنگا جمنی تہذیب کی بقا کے لیے ملک میں اردو کا وجود لازمی ہے۔ اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن دہلی کے جنرل سکریٹری نے اپنی رپورٹ پیش کرتے ہوئے بتایا کہ گزشتہ سال دھامپور میں قائم کی گئی ''بھارت لائبریری'' اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہے۔ ڈاکٹر محمد شمعون، ڈاکٹر محمد فاضل خاں، ڈاکٹر سید احمد خاں، محمد آصف، مولانا محمد فرقان قاسمی، ڈاکٹر ریاض احمد شمسی، حکیم عطاء الرحمٰن اجملی، محمد تنظیم خاں وغیرہ نے بھی اظہار خیال کیا۔

(ہندوستان ایکسپریس، نئی دہلی)

غزل کی روایت اور جدید ادبی رجحانات

● نئی دہلی۔ 16 مارچ، ادب کا جے این یو سے اور جے این یو کا ادب سے کافی گہرا رشتہ رہا ہے۔ جس میں اردو ادب بھی شامل ہے۔ ادھر کچھ دنوں سے کیمپس میں اردو سے متعلق سرگرمیوں میں کافی تیزی آئی ہے۔ یوم جمہوریہ کے موقع پر سابرمتی لٹریری کلب نے ایک آل انڈیا مشاعرہ کا انعقاد کیا تھا گزشتہ روز سابرمتی میس میں ''غزل کی روایت اور جدید ادبی رجحانات'' کے موضوع پر ایک ادبی مباحثے کا انعقاد کیا گیا۔ اس مباحثے میں شرکت کرنے والوں میں معید رشیدی، راغب اختر، سالم سلیم، فیاض احمد وجیہہ، وسیم ساغر اعظمی، ہادی رہبر، محمد اکرم، محمد مغنی، عبدالرافع، واثق الخیر، امتیاز احمد اور منتظر قائمی کے نام سرفہرست ہیں۔ مباحثے میں ایکسپرٹ کی حیثیت سے جامعہ میں استاذ اور اردو کے شاعر احمد محفوظ مدعو تھے۔ مباحثے کا آغاز معید رشیدی کے مضمون سے ہوا۔ اس کے بعد راغب اختر نے بحث کا آغاز ایک سوال سے کیا، جس کے بعد تمام شرکا نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا۔ مباحثے میں سالم سلیم، فیاض وجیہہ اور امتیاز احمد نے پراثر انداز میں اپنی باتیں کہیں۔ بحث کا موضوع گرچہ ''غزل کی روایت اور جدید ادبی رجحانات، تھا تاہم مباحثے کے درمیان کئی دیگر موضوعات پر بھی گفتگو کی گئی۔ آخر میں احمد محفوظ نے ادبی رجحانات کے حوالے سے تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ آج جب دنیا کے تمام موضوعات پر اجتماعی بحث ہورہی ہے ادب ایک ایسا موضوع بن کر رہ گیا ہے جس پر اب بات بھی نہیں کی جاتی اور ایسے میں یہ کوشش اپنی نوعیت کی پہلی اور کامیاب کوشش ثابت ہوئی ہے۔ (سالار، بنگلور)

اردو میڈیم کے بچے کسی سے کم نہیں

● نئی دہلی۔ 26 مارچ، دہلی کے معیاری اور سب سے مہنگے پبلک اسکول، ماڈرن اسکول، بارہ کھمبا روڈ میں سماجی طور پر پسماندہ طبقات کی دو بچیوں کے داخلے کا معجزہ دیکھنے میں آیا۔ یہ دونوں بچیاں ندا خانم اور افرا اجملی پرانی دہلی کے شفیق میموریل سینئر سیکنڈری اسکول، باڑہ ہندوراؤ کی 5ویں جماعت کی طالبات ہیں۔ ندا خانم کے والد عبدالمومن صاحب شیدی پورہ، قرول باغ کی مسجد کے امام ہیں جب کہ افرا اجملی کے والد جناب عارف اجملی تھری وہیلر اور کار کے ڈرائیور ہیں۔

دراصل ماڈرن اسکول، بارہ کھمبا روڈ، نئی دہلی میں اسکول کے سابق طلبا کی تنظیم نے ایک اسکیم اُن بچوں کی بہتر تعلیم کے لیے پیش کی ہے جس میں اُن والدین کے دو بچوں کو اسکول میں داخلہ دیا جاتا ہے جو اپنی کمائی پر ٹیکس

نہیں دیتے یعنی معاشی طور پر پسماندہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔اس سلسلے میں تنظیم دو بچوں کی تعلیم کا چھٹی جماعت سے 12ویں تک مکمل خرچ برداشت کرتی ہے۔اِس سال پسماندہ طبقات کے 200 سے زیادہ بچوں نے ابتدائی مرحلے کے اِمتحان میں حصہ لیا جن میں سے 40 کو فائنل انٹرویو کے لیے منتخب کیا گیا۔اِن 40 بچوں میں سے جن 2 خوش نصیب بچیوں نے کامیابی حاصل کی،اُن میں ندا اور اِفرا اصلی رہیں۔اِس اِمتحان کی شرائط یہ ہوتی ہیں کہ پانچویں جماعت کے فائنل میں طالب علم کے مجموعی طور پر 75فی صد نمبرات ہونے چاہئیں۔علاوہ ازیں بچوں کے والدین کی تنخواہ پر ٹیکس نہیں ہونا چاہیے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اقتصادی طور پر پچھڑے طبقات سے ہیں۔نداخانم کے 700/579 نمبر تھے اور اِفرا کے 700/575 نمبر تھے۔

شفیق میموریل اُردو میڈیم اِسکول کی پانچویں جماعت کی ان دونوں بچیوں کی کامیابی کا سہرا دو لوگوں کے سر ہے۔تعلیمی تنظیم فرینڈز فار ایجوکیشن کے صدر جناب فیروز بخت احمد نے ماڈرن اسکول کے منتظمین سے درخواست کی تھی کہ اسکول میں نہ صرف کچھ پسماندہ بچوں کو داخلہ دیا جائے اور اُن کی تعلیم کا پورا پورا اِنتظام کیا جائے۔شفیق میموریل سینئر سیکنڈری اسکول کی بچیوں کی کامیابی پر جب جناب فیروز بخت احمد سے تاثرات لیے گئے تو اُنھوں نے کہا،" مجھے اِس بات کا بخوبی اندازہ ہے کہ ہمارے اُردو میڈیم کے بچے بھی ذہین ہوتے ہیں مگر اِن بچوں کو مواقع حاصل نہیں ہوتے۔"بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ اُردو میڈیم کی اِن دونوں بچیوں کا داخلہ ناممکنات میں سے ہے مگر بقول جناب صبغت اللہ صدیقی،اِن دونوں بچیوں نے ماڈرن اِسکول میں داخلہ لے کر یہ ثابت کر دیا کہ پچھڑے طبقات کی مسلم بچیاں اگر چاہیں تو تعلیمی بلندیوں کو چھو سکتی ہیں۔

نداخانم کے والد جناب عبدالمومن نے خدا کا شکر بجالاتے ہوئے کہا کہ یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ آج ہندوستان میں ماڈرن اسکول جیسے ادارے بھی موجود ہیں کہ جن میں نہ صرف سیکولر اقدار کو اہمیت حاصل ہے بلکہ جہاں پچھڑے ہوئے طبقات کے بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے راستے کھلے ہوئے ہیں۔

صبغت اللہ صاحب نے نہ صرف اِن بچیوں کو اِنٹرنس ٹیسٹ کے لیے تیار کیا بلکہ اِن کو این۔سی۔ای۔آر۔ٹی۔ کا وہ نصاب بھی خرید کر مہیا کرایا جس میں سے اِمتحان ہونا تھا۔ نداخانم اور اِفرا اصلی نے محض چار دن کی تیاری کے بعد اِتنی بڑی کامیابی حاصل کر لی۔اِن دونوں بچیوں کو شفیق میموریل اسکول کے پرنسپل صاحب کے علاوہ جن اساتذہ حضرات نے اس مقابلہ جاتی اِمتحان کے لیے تیاری کرائی، اُن میں وسیع اصغر صاحب،خرم سلیم صاحب،منوج کمار صاحب اور افضل صاحب کے نام نمایاں ہیں۔ (ڈاک سے)

اردو ڈراما پر سیمینار اور ورکشاپ

●(پادلی۔ جلگاؤں)۔ گذشتہ دنوں فاران ایجوکیشنل سوسائٹی پادلی (جلگاؤں) کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے تعاون سے اردو ڈراما پر ایک سیمینار اور ورکشاپ کا انعقاد مولانا ابوالکلام آزاد لائبریری میں کیا گیا۔ جناب خیال انصاری کی صدارت میں منعقد ہونے والے اس سیمینار میں ممبئی سے تشریف لائے اردو کے معروف ڈراما نگار، ہدایت کار جناب اقبال نیازی نے اپنے مقالے میں اردو ڈراما اور تھیٹر کی موجودہ صورت حال پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے اردو ڈراما سے عوام کی عدم دلچسپی اور اس کی وجوہات بیان کیں، نیز اردو ڈراما اور تھیٹر کے فروغ کے لیے عملی اقدامات کرنے کی موثر تجاویز پیش کیں انھوں نے کہا" اردو ڈراما کی ایک مستحکم روایت رہی ہے اور آج اگر اردو ڈراما گھٹنوں کے بل چل رہا ہے تو مستقبل میں یقیناً اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کرلے گا اور اپنی تہذیبی روایات سے مل کر ایک نئی دنیا آباد کرے گا۔" اقبال نیازی صاحب نے اردو میں ڈراموں کی کمی کا رونا رونے والوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ بدگمانی ہے کہ اردو میں ڈرامے نہیں ہیں حقیقت تو یہ ہے کہ اردو میں ڈرامے بہت ہیں البتہ تھیٹر نہیں ہے اور ہمیں اردو تھیٹر کے قیام اور احیاء کی کوششیں کرنی چاہیے۔" اقبال نیازی صاحب کے اس کلیدی خطبے کے بعد حاضرین نے ڈراموں سے متعلق متعدد سوالات کیے جن کے انھوں نے اطمینان بخش جوابات دیے۔ اس سیشن میں جناب اقبال نیازی کے علاوہ ایم مبین (بھیونڈی) معین الدین عثمانی، ایم رفیق مشتاق کریمی، ایس ایم انور اور صدر اجلاس جناب خیال انصاری نے بھی اردو ڈراموں کی صورتحال پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ نظامت کے فرائض ناصر حسین شیخ اختر نے انجام دیے۔

دوپہر کے سیشن میں جناب اقبال نیازی کی سربراہی میں ڈراما ورکشاپ کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں شہر کے مختلف ثانوی اور اعلیٰ ثانوی اسکولوں کے طلبہ کو برائے تربیت مدعو کیا گیا تھا۔ ورکشاپ میں باہر سے تشریف لائے مہمانان اور اساتذہ کی بڑی تعداد موجود تھی۔ مشتاق کریمی نے اقبال نیازی کے 25 سالہ ڈراما اور تھیٹر کے سفر کا جائزہ لیا اور انھیں اردو ڈراما اور تھیٹر کے فروغ کے لیے مخلصانہ کوشش کرنے والی اہم شخصیت قرار دیا۔ اقبال نیازی نے طلبہ کو ڈرامے کی تیاری اور اسٹیج کیے جانے کے لوازمات کی نہ صرف معلومات دی بلکہ طلبہ سے حاضر دماغی اور یادداشت کو تیز کرنے کی بہت ہی دلچسپ مشقیں کروائیں جو بڑی نتیجہ خیز ثابت ہوئیں اور ناظرین نے دیکھا کہ جو بچے اپنا نام بتاتے ہوئے کچھ دیر پہلے ہچکچا رہے تھے وہ تین گھنٹے کے ورکشاپ کے

بعد اقبال نیازی صاحب کے ساتھ ڈراموں کے سین کر رہے تھے، مکالمے بے خوفی سے ادا کر رہے تھے۔ موصوف نے خود بھی ایک بیحد جذباتی سین پیش کر کے طلبہ اور ناظرین کو دم بخود کر دیا۔ اس مختصر سے ورک شاپ سے طلبہ میں خود اعتمادی کا احساس بھی پیدا ہوا۔ شام سات بجے تک یہ ورک شاپ کامیابی سے چلتا رہا۔ سوسائٹی کے صدر اشفاق سر، سکریٹری شریف سر نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ یاول جیسے چھوٹے شہر میں پہلی بار ڈراما اور ورکشاپ جیسی ایک نئی سرگرمی سے طلبہ و اساتذہ میں بیحد جوش و خروش تھا۔ (ڈاک سے)

حبیب جالب کو نشان امتیاز

● اسلام آباد۔ 23 مارچ، پاکستان کے مشہور انقلابی شاعر حبیب جالب کو حکومت پاکستان نے ان کی خدمات کے صلے میں ملک کے سب اعلیٰ شہر اعزاز ''نشان امتیاز'' سے نوازا ہے۔ حبیب جالب 1993 میں خالق حقیقی سے جاملے تھے اور یہ ایوارڈ انھیں ان کی وفات کے 16 برس بعد دیا گیا ہے۔ کسی ادبی شخصیت کو یہ ایوارڈ پہلی مرتبہ دیا گیا ہے۔

اپنی زندگی کا زیادہ وقت اپنے اشعار و افکار کی وجہ سے قید میں گزارنے والے حبیب جالب کی بیٹی طاہرہ جالب نے یہ ایوارڈ ایوان صدر اسلام آباد میں ایک تقریب میں وصول کیا۔ یہ اعزاز حبیب جالب کے 81 ویں یوم پیدائش سے ایک دن قبل دیا گیا ہے۔ طاہرہ حبیب نے بتایا کہ ان کی والدہ نے 1993 میں والد کی وفات کے بعد حکومت سے مالی امداد لینے سے انکار کر دیا تھا، تاہم یہ ایوارڈ حکومت پاکستان عوام کی جانب سے دے رہی ہے۔ انھوں نے تو کام ہی پاکستانی عوام کے لیے کیا تھا اور یہ ان (جالب) کی خدمات کا اعتراف ہے۔ ان سے دریافت کیا گیا کہ آیا وہ سمجھتی ہیں کہ اس اعزاز سے ان کی شاعری کو مزید فروغ ملے گا تو طاہرہ کا جواب تھا کہ ''ان کا کام کسی اعزاز کا محتاج نہیں۔ ان کا کام خود اپنے منہ بولتا ہے۔ جو وقت کی آواز ہے وہ ان کا کلام ہے۔''

اپنی سیاسی زندگی کا آغاز حبیب جالب نے کمیونسٹ پارٹی سے کیا لیکن بعد میں نیپ کے پرچم تلے آکھڑے ہوئے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کا زیادہ تر حصہ یا تو قید خانوں یا پھر سڑکوں پر گزارا۔

حبیب جالب کی شاعری نہ صرف سیاسی کارکنوں بلکہ اہم سیاستدانوں میں بھی کافی مقبول تھی۔ گزشتہ دنوں صوبہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ شہباز شریف بھی اپنے عوامی جلسوں میں ان کی نظمیں ترنم سے پڑھ کر سناتے رہے ہیں۔ معروف شاعر قتیل شفائی نے حبیب جالب کی یاد میں کہا تھا:

اپنے سارے درد بھلا کر اوروں کے دکھ سہتا تھا
ہم جب غزلیں کہتے تھے وہ اکثر جیل میں رہتا تھا
آخر کار چلا ہی گیا وہ روٹھ کے ہم فرزانوں سے
وہ دیوانہ جس کو زمانہ جالب جالب کہتا تھا

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

علی سردار جعفری یادگاری خطبہ

● شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی کے زیر اہتمام 23 مارچ کو جے پی نائیک بھون کے کانفرنس ہال میں پہلے علی سردار جعفری یادگاری خطبے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر محمود الرحمٰن نے ''علامہ اقبال کی شاعرانہ بصیرت اور فلسفۂ حیات'' کے موضوع پر خطبہ پیش کیا۔ اس تقریب کی صدارت پروفیسر عبدالستار دلوی نے کی۔

ڈاکٹر محمود الرحمٰن نے اپنے خطبہ میں کہا ''علی سردار جعفری کو جہاں ترقی پسند تحریک کا سپہ سالار تسلیم کیا گیا ہے، وہاں غالب، اقبال، جوش اور شبلی کی دانشورانہ عظمت کو ان کی 86 سالہ زندگی میں رچا بسا دیکھا جا سکتا ہے۔'' انھوں نے شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی کے صدر پروفیسر صاحب علی کو مبارکباد پیش کی کہ انھوں نے اپنے شعبے میں علی سردار جعفری یادگاری خطبے کا آغاز کیا۔

اپنے موضوع کا احاطہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمود الرحمٰن نے فرمایا کہ علامہ اقبال کے فلسفے اور شاعری کا مقصد ایک مکمل انسان کا تصور پیش کرنا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اقبال کے فلسفۂ حیات میں توحید، رسالت اور قرآن حکیم خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے انھوں نے مزید کہا کہ اقبال کے نزدیک انسانی زندگی ایک نعمتِ خداوندی ہے اور انسان کو کسی قیمت پر بھی رجائیت کا دامن چھوڑ کر قنوطیت کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر محمود الرحمٰن نے اقبال کی 'خودی' کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ اقبال کی شاعری بنی نوع انسان کو زندگی کی جد و جہد میں اعلیٰ اخلاقی قدروں اور محبت کا ابدی اور آفاقی پیغام دیتی ہے۔

اس عالمانہ خطبے کو سامعین ہمہ تن گوش ہو کر سماعت فرما رہے تھے۔ پروفیسر عبدالستار دلوی نے اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر صاحب علی کو شعبے کی سرگرمیوں کے لیے مبارکباد پیش کی۔ علامہ اقبال کے افکار و خیالات کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے انھوں نے دوٹوک الفاظ میں کہا کہ علامہ اقبال پاکستان کے قیام کے خواہاں نہیں تھے۔ بلکہ وہ ہندوستان ہی میں مسلم اکثریت کے ایک اسٹیٹ کے خواہاں تھے۔

ابتدا میں شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر صاحب علی نے مہمانوں کا استقبال

کیا اور شعبۂ اردو کے رواں سال کی سرگرمیوں کی تفصیلات بھی پیش کیں۔ اس تقریب میں شہر ممبئی کے علم دوست حضرات کثیر تعداد میں موجود تھے۔ معز ؛ قاضی کے شکریے پر تقریب کے اختتام کا اعلان کیا گیا۔ (ڈاک سے)

زبیر رضوی کے ساتھ ایک شام

● حیدرآباد۔ 30مارچ، میری ذہنی تربیت حیدرآباد ہی میں ہوئی اور میرے دوست شاذ تمکنت نے مجھے فیض، ساحر، مجاز اور اردو کے اہم شاعروں کے کلام سے روشناس کرایا اور اس طرح ادب و شعر سے میرا رشتہ مضبوط ہوتا چلا گیا۔ آج پہلا موقع ہے کہ تین گھنٹے تک میرے بارے میں اور میری شاعری کے بارے میں دانشوروں نے اپنے احساسات پیش کیے اور میں سنتا رہا۔ ان خیالات کا اظہار اردو کے ممتاز شاعر جناب زبیر رضوی نے اردو مجلس حیدرآباد کے زیر اہتمام منعقدہ ''ایک شام زبیر رضوی کے نام'' کے زیر عنوان ایک ادبی محفل میں کیا جو اتوار شام ساڑھے چھ بجے اردو ہال، حمایت نگر، حیدرآباد میں انعقاد پذیر ہوئی۔ زبیر رضوی نے اپنے تجربات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ انھیں ریڈیو میں 30 برس تک کام کرنے کا موقع ملا اور وہیں انھیں پتہ چلا کہ اختصار اور جامعیت کے ساتھ اپنی بات کو پیش کرنا کس قدر ضروری ہے۔ زبیر رضوی نے کہا کہ شاعر نظم کو ایک خاص فضا اور ایک خاص ذہنی کیفیت کے زیر اثر تخلیق کرتا ہے اور جب نظم تخلیق ہوجاتی ہے اور قاری تک پہنچ جاتی ہے تو پھر وہ کیفیت اور وہ فضا نظم کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ انھوں نے بڑی تعداد میں شائقین کی موجودگی پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے اردو مجلس کے ذمے داروں کا شکریہ ادا کیا۔ اس ادبی شام میں سجنے والی محفل کے صدر مجتبیٰ حسین نے زبیر رضوی سے اپنے ذاتی مرسام کا ذکر کرتے ہوئے زبیر رضوی پر لکھا گیا۔ اپنا خاکہ پیش کیا۔ اس خاکے میں انھوں نے زبیر کی شاعری، ان کے ترنم، شعری مزاج اور فن کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے پر مزاح انداز تحریر سے ساری محفل کو زعفران زار بنا دیا۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے اپنے مضمون میں کہا کہ زبیر کی شاعری کا منظر، پس منظر اور پیش منظر ہمارے معاشرے ہی کا منظر، پس منظر اور پیش منظر ہے۔ زبیر رضوی کی مختلف نظموں کا تجزیہ کرتے ہوئے پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے کہا کہ ان کی شاعری میں غنائیت ایک اہم پہلو ہے جو نظموں کی اثر انگیزی میں اضافہ کرتی ہے۔ جناب مصحف اقبال توصیفی نے زبیر کی نظموں میں ذہانت، باخبری اور دانشوری کے عناصر کی نشاندہی کرتے ہوئے بتایا کہ زبیر رضوی کے درون میں قدیم و جدید کی آمیزش ہے جس کے نتیجے میں ''پرانی بات ہے'' کے سلسلے میں نظمیں معرض وجود میں آئیں۔ سبزۂ ساحل کی نظم صادقہ کے بارے میں انھوں نے کہا کہ زبیر اس نظم کے ذریعے زمینی اور زمانی امکانات پیش کرتے ہیں۔ جناب علی ظہیر نے کہا کہ زبیر کی گرفت الفاظ پر بہت مضبوط ہے۔ انھوں نے نئی نظم کے مختلف اہم فن کاروں جیسے میراجی، ن م راشد وغیرہ پر بات کرتے ہوئے زبیر رضوی کی نظموں کے حسن کو واضح کیا۔ پروفیسر رحمت یوسف زئی نے سبزۂ ساحل کا جائزہ لیتے ہوئے چند نظموں کے اہم کردار علی بن تقی اور صادقہ کے بارے میں اظہار خیال کیا۔ انھوں نے اس مجموعے کی نظم صادقہ کو بے حد موثر قرار دیتے ہوئے زبیر رضوی کی نظم گوئی پر جامع مضمون پیش کیا۔ جناب حسن فرخ نے اپنے مضمون میں کہا کہ اکثر شعرا کا حال یہ ہے کہ وہ مقبولیت کی بلندی پر پہنچنے کے بعد جمود کا شکار ہوجاتے ہیں لیکن زبیر رضوی نے مقبولیت کی انتہا پر پہنچ کر اپنے معیار اور تخلیقی فعالیت پر جمود طاری ہونے نہیں دیا۔ ''پرانی بات ہے'' کی نظموں میں آٹھویں دہائی کے مسلمانوں کی کشمکش اور بے حسی کا ذکر ملتا ہے جس کا تعلق زبیر آج کے حالات سے پیدا کرتے ہوئے اس بے بسی کو پیش کرتے ہیں جو انسانی اقدار پر مسلط ہے۔ اجلاس کی کارروائی صدر اردو مجلس پروفیسر یوسف زئی نے چلائی اور آخر میں ان کے شکریے پر محفل کا اختتام عمل میں آیا۔ (ڈاک سے)

یادِ رفتگاں

بجنور۔ 8مارچ، مشہور و معروف شاعر اور ادیب نشتر خانقاہی کو ان کی تیسری برسی پر شہر کے دانشوروں نے انتہائی عقیدت کے ساتھ یاد کیا۔ انھیں بابو سنگھ چوہان اسمرتی سنستھان کے زیر اہتمام جین دھرم شالہ میں منعقدہ جلسے میں مقررین نے ان کے فن اور شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ نشتر خانقاہی سرزمین بجنور میں پیدا ہوئے، وہ ایک عظیم قلمکار تھے۔ لیکن افسوس کہ موجودہ نسل نہ تو ان کی شاعری اور ادبی خدمات کی صحیح قدردانی کر پائی اور نہ ہی انھیں قابل لحاظ اعزاز دے پائی۔ لیکن آنے والی نسل ان کی ادبی صلاحیتوں کی قدر ضرور کرے گی۔ تب یہ ثابت ہوگا کہ وہ کتنے عظیم فنکار تھے۔ پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے بجنور ٹائمز گروپ کے چیف ایڈیٹر چندر منی رگھوونشی نے کہا کہ آنجہانی نشتر خانقاہی تلخ حقیقتوں کو شاعری کا جامہ پہنانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ معروف ہندی ادیب ڈاکٹر گری راج شرن اگروال نے نشتر خانقاہی سے وابستہ واقعات بیان کرتے ہوئے کہا کہ وہ دوسروں کے درد کو سمجھنے والے حساس انسان تھے۔ انھوں نے کہا کہ وہ درحقیقت درویش صفت انسان تھے۔ اس موقع پر سینئر صحافی وی پی گپتا، ڈاکٹر اے جے بھولا ناتھ تیاگی، شفق بجنوری، شکیل بجنوری، ایڈوکیٹ رام چندر سنگھ راجپوت، معروف مصور وائی کے سنہا، طنز و مزاح کے ہندی شاعر حقہ بجنوری، صحافی مرزا طالب بیگ، راجیندر

راجپوت، امیر نہٹوری، راجیند رگوتم، سرفراز احمد، حسنین نقوی، نیرج چودھری و دیگر حضرات نے نشتر خانقاہی کو جذبات انگیز خراج عقیدت پیش کیا۔ سشیل کرنوال نے ناک سے بانسری بجا کر خراج عقیدت پیش کیا۔ جبکہ نشتر خانقاہی کے صاحبزادے نے نشتر فیضاب نے اپنے والد کی یاد میں ایک نظم سنا کر ماحول کو غمگین کردیا۔ پروگرام کے آغاز میں بزرگ گلوکار، اشونی بھٹناگر نے ساز کے ساتھ مرحوم کی ایک غزل پیش کی۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر سوریہ منی رگھوونشی اور ڈاکٹر انل چودھری نے مشترکہ طور پر کی۔ (صحافت، حیدرآباد)

اعزاز و اکرام

● پٹنہ۔ ریاست بہار کی معروف ادبی وثقافتی تنظیم بھارتیہ ساہتیہ کار سنسد، سمستی پور کی طرف سے گزشتہ دنوں ایک باوقار تقریب میں جدید غزل گو شاعر جناب شمیم قاسمی کو مشہور ہندی شاعر شری کیدار ناتھ سنگھ کے ہاتھوں پرکاش فکری ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ یہ ادارہ ڈاکٹر ہری ونش ترن اور ڈاکٹر جیالال آریہ کی بے لوث کوششوں کے طفیل مختلف زبانوں کے فنکاروں کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتا رہا ہے۔ (ڈاک سے)

● لندن۔ 17 مارچ، مصری مصنف اور اسکالر یوسف زیدان کو ان کے مقبول عام ناول ''عزازیل'' کے لیے عرب فکشن کا بین الاقوامی انعام دیا گیا ہے۔ اس ایوارڈ کو ''عربی بوکر'' کہا جاتا ہے اور اسے برطانیہ کی بوکر پرائز فاؤنڈیشن کے ساتھ دیا جاتا ہے۔ عزازیل کو پانچویں صدی کے اسکندریہ اور شام کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ زیدان کو کل ملا کر 60 ہزار ڈالر کا انعام ملے گا۔ علاوہ ازیں ان کے ناول کا انگریزی ترجمہ بھی کیا جائے گا۔ 2009 کے انعام کا اعلان ابوظہبی بین الاقوامی کتابوں کے میلے میں کیا گیا۔ زیدان کو انعام ملنے سے مصر کا قبطی چرچ ناخوش ہے اس کا کہنا ہے کہ انھوں نے عیسائیوں کے اندرونی معاملوں میں مداخلت کی ہے۔ مگر زیدان نے رائٹر سے بات کرتے ہوئے کہا کہ قبطی چرچ 640 میں اسلام کی آمد سے قبل کی صدیوں کو قبطی چرچ کی عینی تاریخ سمجھتا ہے مگر مجھے یہ قبول نہیں مجھے اس میں کوئی معقولیت نظر نہیں آتی۔ (سالار، بنگلور)

● نئی دہلی۔ 17 مارچ، انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز کی جانب سے ہر سال دیا جانے والا سالانہ شاہ ولی اللہ ایوارڈ اس سال معروف قانون داں پروفیسر طاہر محمود کو دیا جائے گا۔ یہ فیصلہ شاہ ولی اللہ ایوارڈ بورڈ کی میٹنگ میں اتفاق رائے سے لیا گیا۔ طاہر محمود کو اس ایوارڈ کے تحت ایک لاکھ روپئے کا نقد انعام اور شاہ ولی اللہ ٹرافی پیش کی جائے گی۔ ایوارڈ کی جونیئر کیٹگری میں مقالہ نگاری کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق رجسٹرار پروفیسر فیضان، مصطفی اور ڈاکٹر افروز عالم کے مشترکہ مقالے کو انعام کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ ان مقالہ نگاروں کو 25 ہزار روپئے کا نقد انعام اور ٹرافی مشترکہ طور پر دی جائے گی۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● کولکاتا۔ پچھلے دنوں کولکاتا کے صوفی جمیل اختر سے منسوب ہر سال اردو کے ایک سرکردہ ادیب کو دیے جانے والے ایوارڈ کو ملک کے ممتاز مزاح نگار مجتبیٰ حسین کی خدمت میں ایک باوقار تقریب میں پیش کیا گیا۔ یہ ایوارڈ ایک مومنٹو، توصیف نامے اور شال کے علاوہ پچیس ہزار روپئے کیسۂ زر پر مشتمل ہے۔ تقریب کی صدارت پروفیسر قیصر شمیم نے انجام دی۔ محمد سلیم ممبر لوک سبھا (سی پی ایم) نے ایوارڈ پیش کرتے ہوئے کہا'' گلوبلائزیشن کا زوال تو ہوسکتا ہے لیکن مجتبیٰ حسین کی تحریروں کو زوال نہیں آسکتا کیونکہ ان تحریروں میں وہ تازگی اور شگفتگی ہے جو پڑھنے والوں کو تازہ دم کردیتی ہے۔ مجتبیٰ حسین کا تعلق حیدرآباد دکن سے ہے جو اردو شعر وادب کا اہم مرکز رہا ہے اور جس نے مخدوم محی الدین جیسی قدآور شخصیت کو جنم دیا۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہمارے درمیان مجتبیٰ حسین جیسے ادیب موجود ہیں۔'' روزنامہ کولکاتا کے مدیر احمد سعید ملیح آبادی نے کہا کہ مشکل نثر لکھنا آسان ہے لیکن آسان نثر لکھنا انتہائی مشکل کام ہے۔ انھوں نے مجتبیٰ حسین کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ اپنی تحریروں کے ذریعے آج کے کرب زدہ ماحول میں خوشیاں بکھیر رہے ہیں۔ افسانہ نگار انیس رفیع نے بڑے دلچسپ انداز میں مجتبیٰ حسین کی خوبیوں کا والہانہ انداز میں ذکر کیا۔ ڈراما نگار ظہیر انور نے کہا کہ اگر آج کے قلم کاروں کی تحریروں میں مجتبیٰ حسین کی شگفتگی کا ایک چوتھائی حصہ بھی آجائے تو ان کی قسمت سنور جائے۔ وسیم الحق مدیر اخبار مشرق نے کہا کہ آج کی نسل کے لیے یہ بات بڑے فخر کی ہوگی کہ انھوں نے مجتبیٰ حسین کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ صدر جلسہ پروفیسر قیصر شمیم نے، جو جمیل اختر ٹرسٹ کے صدر بھی ہیں، مجتبیٰ حسین کی گوناگوں شخصی اور ادبی خوبیوں کا ذکر کیا۔ ڈاکٹر خواجہ نسیم اختر، لیبر کمشنر حکومت مغربی بنگال نے جلسے کی نظامت کی۔ مجتبیٰ حسین نے ایوارڈ قبول کرتے ہوئے شکرگزاری کے انداز میں کہا کہ فی زمانہ ایوارڈوں کی بہتات ہوگئی ہے اور وہ اس انداز سے دیے جاتے ہیں کہ ادیب کی انا مجروح ہوتی ہے۔ یہ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ بہت سے ایوارڈ بے توقیر ہوتے جارہے ہیں جو ایوارڈ خلوص اور محبت کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے اسے پاکر بے حد مسرت ہوتی ہے۔ مجتبیٰ حسین نے اپنے قدردانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ چاہنے والوں کی محبت ہی ان کے قلم کو توانائی بخشتی ہے۔ تقریب کے آغاز میں ڈاکٹر شکیل احمد خاں سکریٹری صوفی جمیل اختر ٹرسٹ نے ادارے کی سرگرمیوں کی رپورٹ پیش کی۔ ٹرسٹ کے سرپرست اور صوفی جمیل اختر کے فرزند ڈاکٹر شکیل اختر نے مہمانوں کا شکریہ ادا

کیا اور اپنے چھوٹے بھائی فہیم اختر مقیم لندن کو دعائیں دیں جو اس ایوارڈ کے اصل محرک ہیں۔ (ڈاک سے)

● کردار آرٹ اکادمی (ممبئی) کے بانی صدر، اردو کے مشہور ڈراما نگار، ہدایت کار اقبال نیازی کو شہر ممبئی کے ایک معتبر ادارے مجروح اکادمی نے ایک باوقار تقریب میں مجروح اکادمی ایوارڈ سے نوازا۔ ڈراما کے ذریعے قومی یکجہتی کے فروغ کے لیے کوشاں اور اردو تھیٹر کی بے لوث خدمات کے اعتراف میں یہ ایوارڈ جناب نواب ملک (وزیرِ محنت حکومت مہاراشٹر) کے ہاتھوں اقبال نیازی صاحب کو تفویض کیا گیا۔ اس موقع پر عمائدینِ شہر کی بڑی تعداد موجود تھی۔ اقبال نیازی کا تحریر کردہ اور ہدایات سے آراستہ اردو ڈراما ''یہ کس کا لہو ہے؟'' جو ممبئی میں 26/11 کے دہشت گردانہ حملوں کے پس منظر میں ہے مہاراشٹر بھر میں نہایت کامیابی سے کھیلا جا رہا ہے اور اب تک اس کے 43 سے زائد شو ہو چکے ہیں۔ گزشتہ 30 برسوں سے اردو ڈراما اور تھیٹر سے وابستہ اقبال نیازی اب تک 100 سے زائد ڈراموں کے 700 سے زائد شو ہندوستان کے مختلف شہروں میں کر چکے ہیں اور انھیں مختلف تنظیموں نے انعامات سے نوازا ہے۔ کردار آرٹ اکادمی کے تمام فنکاروں نے یہ ایوارڈ ملنے پر دلی مسرت کا اظہار کیا ہے۔ (ڈاک سے)

مختصرات

● نئی دہلی۔ 31 مارچ، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی میں غالب میموریل لیکچر بعنوان ''غالب کے عالم تحریر کا مدعا'' منعقد کیا گیا۔ ہندی کے مشہور ناقد مہاتما گاندھی ہندی انٹرنیشنل یونیورسٹی کے موجودہ چانسلر پروفیسر نامور سنگھ نے یہ خطبہ پیش کیا۔ موصوف نے اردو غزل میں غالب کی انفرادیت اور دوسرے شعرا پر ان کی فوقیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے غالب کو از سرِ نو پڑھنے کی دعوت دی۔ دوران خطبہ فاضل مقرر نے اس عنقا دنیا کی طرف اشارہ کیا، جس کی تخلیق غالب نے کی تھی اور اس عنقا دنیا میں داخل ہو کر ہی غالب کی تشریح و تعبیر ممکن ہے۔ انھوں نے کہا کہ کوئی بھی نظریہ غالب کی مکمل تشریح سے قاصر ہے کیونکہ غالب کی تفہیم سماجی اور سیاسی پس منظر میں نہیں بلکہ ادبی تناظر ہی میں ممکن ہے۔

انھوں نے اس حقیقت کی بھی نشاندہی کی کہ ہندی کا وہ آدمی جو اردو نہیں جانتا، کم مایہ ہے۔ خطبے کے بعد غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے لکچر کو تاریخی قرار دیتے ہوئے پروفیسر نامور سنگھ کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ انھوں نے غالب کی شاعری کے ان نازک پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا جن پر تمام شارحین اور ناقدین کی نظر اب تک نہیں پڑی تھی۔ نیز غالب کو بالکل نئے اور منفرد انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی جو کہ اہل نظر کے لیے ایک نمونہ ہے۔ محفل کے صدر ڈاکٹر خلیق انجم نے پروفیسر نامور سنگھ کے لکچر کو یادگاری بتاتے ہوئے ان سے اپنے پرانے روابط کی طرف اشارہ کیا اور اردو ناقدین کے برعکس آسان زبان میں تنقیدی جائزہ پیش کرنے کے لیے شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ یہ خوش آئند بات ہے کہ ہندی کا ایک بڑا ناقد اور دانشور بھی ہندوستانی زبان میں گفتگو کرتا ہے اور آسان زبان کے چلن پر زور دیتا ہے۔ انھوں نے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر ارتضیٰ کریم اور ان کے رفقا کو مبارکباد دی۔ ڈاکٹر توقیر احمد خاں کے اظہار تشکر کے ساتھ پروگرام اختتام پذیر ہوا۔ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی اور دیگر کالج کے اساتذہ اور طلبہ و طالبات نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ (صحافت، دہلی)

● نئی دہلی۔ 21 مارچ، ادب سے بیگانہ رہ کر کوئی بھی قوم خواہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں کتنے ہی مدارج کیوں نہ طے کر چکی ہو ترقی یافتہ نہیں ہو سکتی۔ اس لیے ہماری ذمے داری ہے کہ ہم اپنے ادب کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیں اور مطالعے کی عادت ڈالیں۔ ان خیالات کا اظہار معروف فکشن نگار پروفیسر جوگیندر پال نے کیا۔ وہ اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام دہلی کے بزرگ اور جواں عمر قلمکاروں کے ادبی اجتماع ''نئے پرانے چراغ'' میں بطور صدر اپنا خطبہ پیش کر رہے تھے۔ پروفیسر پال نے موجودہ تنقیدی رویوں اور زبان و ادب کی صورت حال پر بھی روشنی ڈالی۔ قبل ازیں اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر قمر رئیس نے خیر مقدمی خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو اکادمیوں کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ زبان میں موجود تخلیقی انرجی کا زیادہ سے زیادہ حصہ معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے مختص کیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ نئی نسل میں قلمکاروں کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے، لہٰذا ہماری ذمے داری ہے کہ اس جانب توجہ دیں۔ انھوں نے کہا کہ ایک طبقہ ایسا ہے جو یہ کہتا ہے کہ اردو ترقی کر رہی ہے لیکن یہ محض دل بہلاوے کی باتیں ہیں کیونکہ اردو زبان و ادب کا زوال ہوا ہے۔ پروفیسر قمر رئیس نے اردو رسم الخط بدلنے کی سفارش کرنے والوں پر بھی سخت تنقید کی۔ انھوں نے کہا کہ اس سے زبان کو نقصان ہوگا۔ افتتاحی اجلاس کی نظامت معروف ڈراما نگار انیس اعظمی نے کی۔ اسد رضا نے کہا کہ انٹرنیٹ کے دور میں زبانیں سمٹ گئی ہیں اور کوئی بھی صحافت عوام سے زبان کو کاٹ کر ترقی نہیں کر سکتی۔ انھوں نے کہا کہ ممکن ہے کہ خبروں کی زبان کا معیار ذرا کمزور ہوا ہو لیکن اخبارات میں شائع ہونے والے مضامین کی زبان کافی معیاری ہوئی ہے۔ ڈاکٹر شریف احمد نے کہا کہ صحافت آج بھی جمہوریت کا چوتھا ستون ہے اور نئی نسل کے لوگ اس کی آبیاری کر رہے ہیں۔ عبید الرحمٰن ہاشمی نے کہا کہ نئے لوگوں کی حوصلہ افزائی بہت ضروری ہے۔ ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے صحافت کی بجائے شاعری پر گفتگو کی۔
(ہمارا سماج، دہلی)

● علی گڑھ۔ 8 مارچ، ہمارے لیے ضروری ہے کہ تعلیم کے شعبے میں سرسید احمد خاں کے ذریعے کیے گئے اقدامات کو ہم اختیار کریں۔ ان خیالات کا اظہار قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیم کے چیئرمین جسٹس ایم ایس اے صدیقی نے جامعہ اردو میں منعقدہ ایک پروگرام کو خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ جب تک تعصب کو دور نہیں کیا جاتا ہماری قوم ہرگز ترقی نہیں کرسکتی۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان کو ابھی بھی اہلِ وطن بول رہے ہیں لیکن یہ زبان تعصب کا شکار ہورہی ہے۔ یہ عوام کا دکھ درد بیان کرنے والی زبان ہے۔ انھوں نے اردو کو سب سے زیادہ حب الوطنی اور قومی یکجہتی پیدا کرنے والی زبان قرار دیا۔ علیگڑھ کے پارلیمانی رکن چودھری وجیندر سنگھ نے کہا کہ جامعہ اردو ایک عظیم ادارہ ہے اور اس کو یونیورسٹی کا درجہ ملنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ جب تک اقلیتوں کو تعلیم سے نہیں جوڑا جائے گا تب تک اقلیتی طبقہ ترقی نہیں کرسکتا۔ انھوں نے کہا کہ علیگڑھ وہ جگہ ہے جہاں سے تمام دنیا میں پیغام جاتا ہے۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ آنے والے وقت میں اقلیتی طبقہ اپنے اندر صلاحیت پیدا کرکے دنیا پر چھا جائے گا۔ اس سے پہلے شعبۂ قانون کے ریڈر ڈاکٹر شکیل صمدانی نے کہا کہ جامعہ اردو علیگڑھ نے جو تاریخی کام انجام دیا ہے وہ ہندوستان کی تاریخ میں سنہرے الفاظ میں لکھا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ جامعہ اردو کا حق ہے کہ اس کی توسیع کی جائے اور اسے یونیورسٹی کا درجہ دیا جائے۔ اردو ہندوستان کی زبان ہے سمجھا جائے اور اسے اس کا جائز مقام دیا جانا چاہیے۔ اس پروگرام کی صدارت شیخ الجامعہ اردو علیگڑھ جناب محمد قاسم صدیقی نے کی۔ جامعہ کی رجسٹرار صبا خان صاحبہ نے سالانہ رپورٹ پیش کی۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر شکیل صمدانی نے کی اور خلیل احمد مہمانِ خصوصی اور سامعین حضرات کا شکریہ ادا کیا۔ (صحافت، دہلی)

● بدایوں۔ 26 مارچ، اردو زبان کو محض روزی روٹی سے جوڑنے یا اردو اساتذہ، اردو ترجمان تعینات کردینے سے اسے فروغ حاصل نہیں ہوسکتا جب تک کہ یہ عوامی ذہنوں میں ہماری زبان کی شکل نہ اختیار کرلے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار سابق چیئرمین اردو اکادمی یوپی جناب یٰسین عثمانی نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ آج ایک خاص طبقے کی مادری زبان ہونے کے نام سے مشہور اردو کو وہ خاص طبقہ بھی بھلاتا جارہا ہے۔ وہ یہ بھولتا جارہا ہے کہ آخر کس لیے ہم اسے نظرانداز کررہے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے حکومت کی جانب سے جو اقدامات اٹھائے گئے ہیں وہ قابلِ تعریف ہیں لیکن خود اردو والوں کو بھی کچھ کرنا چاہیے۔ چند باتوں کا لحاظ رکھنا لازمی ہے مثلاً کم از کم اردو والے تو اپنا کام اردو میں ہی کریں، مشاعروں کے دوران ناظم حضرات کو چاہیے کہ وہ دوران مشاعرہ تین یا چار مرتبہ عوام کو اردو پڑھنے کی تلقین ضرور کریں۔ انھوں نے بتایا کہ 60 سال قبل اردو ایک قوم کی زبان نہ ہوکر عوامی زبان تھی جسے سبھی لوگ پڑھتے تھے۔ لیکن آج ایسا نہیں ہے یہ جذبہ جس دن عوام کے دل و دماغ پر حاوی ہوگا اردو اس روز اپنی کھوئی ہوئی حیثیت خود بخود حاصل کرلے گی۔ (صحافت، دہلی)

● 18 فروری 2009 بروز اتوار سماج سیوا یوامنڈل یاول کے زیرِ اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے تعاون سے ''انٹرنیٹ اور اردو زبان'' کے عنوان سے ایک سیمینار بمقام مولانا ابوالکلام آزاد لائبریری یاول۔ زیر صدارت الحاج عبدالکریم سالار منعقد کیا گیا جس کا افتتاح جناب اقبال نیازی نے شمع فروزی کرکے کیا۔ یہ سیمینار دو سیشن پر مبنی تھا۔

پہلا سیشن صبح 10 بجے سے ایک بجے تک چلتا رہا جس میں انٹرنیٹ کے ماہرین نے اپنے مقالات پیش کیے۔ جن میں اقبال نیازی (اسلام او رانٹرنیٹ)، ایم مبین، بھیونڈی (انٹرنیٹ اور اردو، ابتدا او رحال) ایم رفیق، یاول، (انٹرنیٹ کے نقصانات اور ان سے بچنے کی تدابیر)، مظہر سلیم، ممبئی (ای میل اور اردو زبان)، مشتاق کریمی، جلگاؤں (اردو، انٹرنیٹ اور طلبہ) اور ثاقب اقبال، ناچن (یاہوای میل ایک تعارف) صاحبان نے اپنے مقالات پیش کیے۔ جناب عبدالکریم سالار نے خطبۂ صدارت میں سب سے پہلے ممبئی دہشت گرد حملے کے شہیدوں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اس حملے کی مذمت کی۔ نیز تمام مقالات کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے تیزی سے ترقی کرتی ہوئی قوموں کے ساتھ شانہ بہ شانہ گامزن ہوجانے کا پیغام دیا۔ دوپہر 1 بجے سے 3 بجے تک طعام کا وقفہ تھا۔

3 بجے سے دوسرے سیشن کا آغاز ہوا جس میں اساتذہ اور طلبہ وطالبات کے لیے ایک انٹرنیٹ شو کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں ایم مبین صاحب (بھیونڈی) نے انٹرنیٹ پر ای میل آئی ڈی بنانے اور مختلف ویب سائٹ کھولنے کی ترکیب بتاتے ہوئے www.Nakri.com شادی ڈاٹ کام، یاہو اور ریڈف ڈاٹ کام وغیرہ ویب سائٹس کھول کر دکھائیں۔ اس کام میں شہر سی کمپیوٹر کے ڈائرکٹر جناب چمن سونو نے ان کا تعاون کیا۔

سماج سیوا یوامنڈل کے صدر ایم رفیق، سکریٹری ظہیر خان اور اراکین شیخ یامین، شیخ رفیق، ادریس خان، غلام غوث خان، وغیرہ نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ سیمینار کی نظامت ایس ایم انور نے کی اور رسم شکریہ منڈل کے جوائنٹ سکریٹری ارشد خان نے ادا کی۔ (ڈاک سے)

● نوئیڈا۔ 17 مارچ، عید میلاد النبیؐ اور ہولی کے موقع پر انجمن تعمیر اردو دہلی۔ نوئیڈا کے زیرِ اہتمام اردو اور ہندی کے شعرا کی ایک گنگا جمنی ادبی نشست منعقد ہوئی جس میں اردو اور ہندی کے مشہور شاعروں اور کویوں نے حصہ لیا۔

سامعین میں کئی معزز شخصیات نے شرکت کی۔ آنند موہن زتشی گلزار دہلوی، معتمد اعلیٰ انجمن تعمیر اردو دہلی نے حاضرین کا استقبال کیا اور کہا کہ آج ملک کی سالمیت اور استحکام کے لیے تمام مذاہب، ادیان، فرقوں اور نظریات کے امتزاج و اتحاد کی سخت ضرورت ہے۔ اسے ہندی اور اردو کے ادیب، شاعر، کوی، اساتذہ، اخبار نویس اور دانشور ہی سرانجام دے سکتے ہیں۔ سیاست کو پاکیزہ اور فلاحی بنانے کے لیے اہل قلم کو متحد ہو کر کچھ کرنا چاہیے۔ اس کے بعد گلزار دہلوی نے نعتیہ کلام سے مشاعرے کا آغاز کیا اور ایک نظم بہ عنوان ''گلال ہولی'' بھی پیش کی۔ اس نشست کی نظامت ملک زادہ جاوید نے کی۔ شاعروں اور کویوں میں کرنل شومتل بہار، کنور شیو پرتاپ سنگھ، ہمایوں ظفر زیدی، حسن کاظمی، ملک زادہ جاوید، کیپٹن آلوک سریواستو، شاذ جہانی، شری ورما کرانت، بابا کانپوری، پروفیسر للن پرساد، سابق صدر شعبۂ ہندی دلی یونیورسٹی جن کی صدارت میں یہ مشاعرہ منعقد ہوا۔ راج پال سنگھ یادو، اپندر مشرا، فرحت احساس، نعمان شوق، اشوک مدھپ اور رؤف رامش بھی اس نشست میں شامل تھے۔ نشست میں غزل، نظم، گیت اور قطعات پیش کیے گئے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی۔ 18 مارچ، انجمن ترقی اردو (ہند) کی مجلسِ عاملہ نے اردو کے نامور ادیب جناب آنند لہر کو انجمن ترقی اردو (ہند) جموں و کشمیر شاخ کا صدر نامزد کیا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) نے اس امر کا خط جناب آنند لہر کو لکھتے ہوئے یہ امید ظاہر کی ہے کہ ان کی قیادت میں اردو صوبہ جموں و کشمیر میں ترقی کی نئی راہوں پر گامزن ہوگی۔ (ڈاک سے)

□□□

مشرق و مغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ

مصنف: محمد حسن

پروفیسر محمد حسن نے اپنی اس تنقیدی کاوش میں ادب کی ماہیت، شناخت اور اس کے مجلسی رشتوں، مشرق و مغرب کی تنقیدی نظریات، ان میں یکسانیت اور اختلافات کی نشاندہی کرتے ہوئے ادب اور خارج کے تعلق، ادبی معیار اور ادیب کے سماجی رشتوں اور ان کی معنویت کا جائزہ لیا ہے۔ پوری کتاب سات حصوں اور اکیس ابواب میں منقسم ہے۔ ان حصوں اور ابواب میں تنقیدی ادراک کی ابتدا، افلاطون کے تنقیدی جائزے، ارسطو کی بوطیقا، روم میں تنقیدی نظریات، چینی ادب، جاپانی شاعری کے کلیدی تصورات، سنسکرت تنقید میں دھونی، النکار اور رس، عرب کے تنقیدی نظریات، ایران کے تنقیدی نظریات، زندگی اور تاریخ و تہذیب کے ادب پر اثرات، روس اور امریکا میں نئی تنقید، تشکیلیت اور ساختیت، ہیئتی تنقید، مارکسی تنقید اور تقابلی تنقید جیسے موضوعات کا احاطہ کیا ہے۔

صفحات: 404، قیمت-/28 روپے

اندر سبھا کی روایت

مصنف: پروفیسر محمد شاہد حسین

سنسکرت ڈرامائی روایات کی زائیدہ ''اندر سبھا کی روایت'' ایک ایسی روایت ہے جس نے ہندوستانی ڈرامائی روایات کی توسیع کے ساتھ ایک صدی تک اردو ڈرامے پر اپنے اثرات مرتب کیے، پروفیسر محمد شاہد حسین نے بڑی باریکی سے اس کا جائزہ لیا ہے۔ تین باب اور کئی ذیلی ابواب کے تحت انھوں نے سنسکرت ڈرامے کی روایات، عوامی روایات جیسے رام لیلا، راس لیلا، بہروپیا، بھنڈیتی، بھگت بازی، نقالی، کٹھ پتلی کا ناچ، داستان گوئی، مرثیہ خوانی، مجرے، درباری ڈرامے اور پارسی اسٹیج کا ادبی و فنی نقطۂ نظر سے تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ کیا ہے۔

صفحات: 343، قیمت-/140 روپے

تبصرہ وتعارف

فکر وفن

مصنف: خلیل الرحمٰن اعظمی

صفحات: 205، قیمت: -/151 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6،
آر۔کے۔پورم، نئی دہلی

مبصر: رفعت شمیم، E-122، برہم پتر ہاسٹل، جے۔این۔یو، نئی دہلی-67

''فکر وفن'' اردو کے معتبر ناقد اور ممتاز شاعر خلیل الرحمٰن اعظمی کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ پہلی بار آزاد کتاب گھر، دہلی سے 1956 میں شائع ہوا تھا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے حال ہی میں ان کی تمام تنقیدی تصانیف کو ازسرِ نو شائع کیا ہے۔ ''فکر وفن'' میں دس مضامین شامل ہیں۔ یہ تمام مضامین شاعری سے متعلق ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعری کی پرکھ ایک شاعر ہی بہتر طور پر کرسکتا ہے۔ ایلیٹ کا بھی یہی خیال تھا۔ اردو ادب کی تنقیدی تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے تو اس امر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ شاعری پر بہتر ڈھنگ سے لکھنے والے زیادہ تر ناقدین خود شاعر ہیں۔ ان ناقدین میں محمد حسین آزاد، حالی، نیاز فتحپوری، خورشید الاسلام، آل احمد سرور، وزیر آغا، شمس الرحمٰن فاروقی، عنوان چشتی، حامدی کاشمیری، شمیم حنفی اور عتیق اللہ وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ اس مجموعے میں خلیل الرحمٰن اعظمی نے غالب، ظفر، درد، داغ، مومن، جوش، جمیل مظہری، مجاز اور جذبی جیسے معتبر شاعروں کے کلام پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے اور ان کی شاعری کے بنیادی عناصر اور ان کے شعری مزاج کو سمجھنے کی ایک سنجیدہ اور پرخلوص کوشش کی ہے۔ انھوں نے ان شعرا کے شاعرانہ امتیازات کو پوری طرح اجاگر کیا ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اعلیٰ درجے کی تنقیدیں صرف اعلیٰ ترین ذہنوں کی پیداوار ہوتی ہیں۔ تنقید نگار کی ذہنی سطح ایک مفکر، فلسفی، سائنس داں اور ایک آرٹسٹ کی ذہنی سطح کے برابر ہوگی تب ہی اس کی رسائی اس کے تخلیقی عمل تک ہوسکے گی۔''

وہ ادب کی تنقید کے لیے تربیت یافتہ ذہن، رچی ہوئی شخصیت، نکھرے ہوئے ذوق اور احساس جمال کو ناگزیر سمجھتے ہیں۔ وہ نظری تنقید کے بجائے عملی تنقید پر زور دیتے ہیں۔ اور پامال تنقیدی اصولوں اور نظریات کی پابندی سے گریز کرتے ہیں، وہ متن کی اوّلیت اور ادب کے براہ راست مطالعے پر زور دیتے ہیں اور اسی کی روشنی میں متن کا معیار اور مقام متعین کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک صداقت، حسن اور خیر کے عناصر اچھے ادب کی مشترکہ قدریں ہیں۔ ان قدروں کی تلاش میں نت نئے تجربات تک رسائی حاصل کرنا اور اپنی تخلیقی قوت سے انھیں نئے رنگ و آہنگ میں پیش کرنا اچھے فنکار کا منصب ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے بندھے ٹکے اصولوں اور نظریات کی پابندی سے شعوری طور پر گریز کیا ہے۔ جیسا کہ وہ لکھتے ہیں کہ ''میں نے مروجہ تنقیدی اصولوں اور نظریات کی پابندی کم کی ہے۔ اچھے ادب کا براہ راست مطالعہ کرکے ادب کی خصوصیات کو سمجھنے اور ان کا معیار اور سطح مقرر کرنے سے مجھے زیادہ دلچسپی رہی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ میں ان تنقیدی اصولوں سے ناواقف ہوں لیکن ان نظریات اور اصولوں کے میکانکی استعمال سے جو نتائج نکلے ہیں اور شعروادب کی جس طرح مٹی پلید ہوئی ہے، اس کی بنا پر ان کو برتنے میں میں نے احتیاط و اعتدال سے کام لیا ہے۔ اگر کہیں ان کا عکس ان مضامین میں ہوگا تو بالواسطہ ہوگا۔ براہ راست ان کا ذکر کرنے اور بار بار ان کا اعادہ کرنے سے میں نے عمداً گریز کیا ہے۔

کوئی تخلیقی فن پارہ فنکار کے ذاتی تجربے، علم، خیالات، اس کی داخلی شخصیت اور اس کے لطیف احساسات کے امتزاج سے وجود میں آتا ہے۔ یہ امتزاج جس قدر بھرپور اور مکمل ہوگا، فنی تخلیق اتنی ہی پختہ اور کامیاب ہوگی۔ شعروادب کا رشتہ بنیادی طور سے فن کار کی اپنی شخصیت اور اس کے ذاتی تجربات ومحسوسات سے ہے۔ تجربات ومحسوسات کی سچائی اور زندگی سے براہِ راست تعلق کی بنا پر ہی شاعر اور ادیب فن پارے کی تخلیقی شرائط کو پورا کرنے اور اپنے فن میں دیرپا اور مستقل تاثیر پیدا کرنے کا اہل ہوتا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی ممتاز شاعر (تخلیق کار) ہیں۔ تخلیق کو ان کی ادبی زندگی میں اولیت حاصل ہے۔ تنقیدی تحریریں ان کے ادبی سفر کا دوسرا پڑاؤ ہیں۔ اس امر کا اعتراف وہ خود کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجک نہیں کہ مضمون نگاری کو میری ادبی زندگی میں ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ میں نے اپنی شخصیت کے سارے عناصر کی ترتیب وتہذیب اب تک اسی نقطۂ نظر سے کی ہے کہ شعر کے پردے میں اپنی روح کو بے نقاب کرسکوں۔''

''فکر وفن'' میں شامل تمام مضامین اپنی نوعیت کے اعتبار سے قابل مطالعہ ہیں۔ تاہم غالب، بہادر شاہ ظفر اور جوش ملیح آبادی پر جو مضامین ہیں ان کا اجمالی ذکر یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔ غالب ایک نابغۂ روزگار اور آفاقی شاعر ہیں۔ انھوں نے اردو شاعری کو ایک نیا رنگ وآہنگ اور ذہن دیا۔ ان کی شاعری تہ داری اور رنگارنگی کی بہترین مثال ہے۔ اعظمی کے خیال میں ان کی شاعری کی رنگارنگی شدید اندرونی کشمکش اور ذہنی تصادم کی زائیدہ ہے۔ وہ لکھتے

ہیں کہ" غالب کی شاعری ایک شدید اندرونی کشمکش اور ذہنی تصادم کی پیداوار ہے اسی لیے اس کے ایک سے زیادہ رنگ ہیں۔ جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا اس میں اور رنگوں کا اضافہ ہوگا۔ ایک گرہ کھلے گی تو سو گرہیں اور پیدا ہوں گی ایک آئینے کے بعد دوسرا آئینہ، ایک تعبیر کے بعد دوسری تعبیر اور ایک پردے کے پیچھے ستر پردے نظر آئیں گے۔ غالب نے ان پردوں پر اپنی روح کو بے نقاب کیا ہے۔

" فکروفن" میں شامل مضامین میں" بہادر شاہ ظفر" سب سے اہم مضمون ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی سے قبل کے نقادوں میں نیاز فتح پوری کے علاوہ کسی نے بھی ان کی شاعری کا بغور مطالعہ نہیں کیا اور نہ ہی ان کی شعری جہات اور مقام کو متعین کرنے کی کوشش کی۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے ظفر کی شاعری کو ان کے تمام کلام کی روشنی میں پرکھا ہے اور ان کا معیار اور مقام متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے بہادر شاہ ظفر کو اردو کا بدنصیب شاعر کہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ " بہادر شاہ ظفر اردو کے سب سے بدنصیب شاعر ہیں جن سے محبت کرنے والے بہت ہیں لیکن ان کے شاعرانہ مقام سے دو چار آدمی بھی واقف نہیں۔" وہ ظفر کے شاعرانہ مقام کے تعین میں ان کے کلام کے ایک اچھے اور معیاری انتخاب کو ضروری سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ وہ لکھتے ہیں کہ" ان کے کلام کے اس حصے کا اگر ایک اچھا انتخاب کیا جائے تو نہ صرف یہ کہ وہ ایک مٹتے ہوئے دور کی ترجمانی کرے گا بلکہ ادبی اعتبار سے بھی اس قابل ہوگا کہ ہم ظفر کو اردو کے ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے پیش کر سکیں۔ یہ انتخاب ہماری حزنیہ شاعری میں بہت بڑا اضافہ ہوگا۔"

جوش ملیح آبادی شاعر شباب بھی ہیں اور شاعر انقلاب بھی۔ جوش پر خلیل الرحمٰن اعظمی کا مضمون اپنی نوعیت کا ایک بہترین مضمون ہے۔ جوش کی شاعری میں خلیل الرحمٰن اعظمی کو ان کی تصویر کشی نے بہ طور خاص متاثر کیا ہے۔ ان کے خیال میں یہ لفظی تصویر کشی سودا، انشا اور اکبرالہٰ آبادی سے ہوتی ہوئی جوش کے یہاں اپنی تکمیل کرتی نظر آتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ" یہ تصویر کشی صرف جوش کا قلم کر سکتا ہے اور انھی میں اس کی صلاحیت ہے۔ اس میدان میں وہ منفرد ہیں۔ اس طرح کی شاعری اقبال اور جگر نہیں کر سکتے۔ میر اور غالب کے بس کی بات نہیں۔ سودا، انشا اور اکبرالہٰ آبادی سے ہوتا ہوا یہ ذہن جوش کے یہاں اپنے مکمل شباب پر پہنچ جاتا ہے۔ جوش نے اس ذہن سے بہت کم کام لیا ہے۔ وہ زیادہ تر ان وادیوں میں بھٹکتے رہے جہاں آب و ہوا ان کے لیے موافق نہیں۔"

خلیل الرحمٰن اعظمی کی تنقید کا جوہر معروضیت ہے۔ وہ متن کی تفہیم پر زور دیتے ہیں۔ کسی بھی متن پر اس وقت تک قلم نہیں اٹھاتے ہیں جب تک ان کا ذہن اس پر آمادہ نہ ہو جائے۔ ان کا اسلوب اور انداز فکر ان کا اپنا ہے لیکن وہ اپنے ہم عصر نقادوں سے بھی متاثر رہے ہیں۔ اس کا اعتراف وہ خود کرتے ہیں کہ" موجودہ دور کے ان چند قلم کاروں کا ذکر بے محل نہ ہوگا جن کے انداز فکر اور اسلوب نگارش سے متاثر رہا ہوں۔ ان میں آل احمد سرور، مجنوں، سید عبداللہ، فیض اور فراق کے نام خاص طور پر اہم ہیں۔"

بجلی کی کہانی / اے۔ کے۔ چکرورتی، ایس۔ بی۔ بھٹاچاریہ

مترجم: شبانہ اسلام

صفحات: 87، قیمت: -/18 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی

مبصر: عبدالرب، 265، سابرمتی ہاسٹل، جے۔ این۔ یو۔ نئی دہلی-67

اردو میں سائنسی اور تکنیکی معلومات پر مبنی کتابیں بہت کم لکھی گئی ہیں۔ دوسری زبان سے تراجم کے ذریعے یہ کمی کسی حد تک پوری ہوتی ہے لیکن یہ کافی نہیں۔ اسی طرح ادب اطفال کی بھی اردو میں بے حد کمی ہے کچھ اداروں نے اس سلسلے میں خصوصی توجہ دی ہے لیکن ان کی کوششیں بھی کافی نہیں ہیں اور ادب اطفال سے عام بے اعتنائی کا احساس اب بھی ہوتا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے چلڈرن بک ٹرسٹ اور بچوں کا ادبی ٹرسٹ کے اشتراک سے کافی کتابیں اس مقصد کے تحت شائع کی ہیں، تاکہ بچوں کی خاطر خواہ تربیت بھی کی جاسکے اور سائنسی معلومات کی سطح پر بھی وہ کسی سے پیچھے نہ ہوں اور جس طرح سائنسی علوم پر دوسری زبانوں میں مواد ملتا ہے اردو میں بھی دستیاب ہو" بجلی کی کہانی" بھی اسی سلسلے کی کتاب ہے۔ اس کتاب میں بہت آسان زبان میں تھیلس (Thales) کی دریافت سے موجودہ عہد تک کی بجلی کی داستان قلم بند کی گئی ہے۔ تھیلس 600ق۔م۔ میں یونان میں پیدا ہوا اور اس کا تجربہ بھی بجلی کی دریافت کے سلسلے میں نقطۂ آغاز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کتاب میں اس کے تجربات کا ہی بیان نہیں بلکہ اس کی عام زندگی اور طرز فکر پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ تھیلس کے بعد ڈاکٹر گلبرٹ (1544-1603) کا ذکر ہے جن کی کتاب "De Magnet" خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ ڈاکٹر گلبرٹ" بجلی کی سائنس کے بابا آدم" کہے جاتے ہیں۔

گلبرٹ کے بعد" اوٹو دون گیورک" کے تجربات کا بیان ہے جو میگ برگ کے میئر تھے اور انھوں نے بھی بجلی کی دریافت کے سلسلے میں اہم رول ادا کیا۔ اس کے بعد مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے رائل انسٹی ٹیوشن سائنس داں سر ہمفری ڈیوی کے تجربات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جن کی تحقیقات سے کیمیاوی سائنس میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا اور بجلی کی انوکھی طاقت کو استعمال کرنے کا ایک نیا طریقہ وجود میں آیا۔ اسی طرح ٹیلی گرافی کے اشارات الیکٹرون، ریڈیو

کیلی گرافی وغیرہ پر بھی دلچسپ انداز میں گفتگو کی گئی ہے اور الیکٹرونکس کے میدان میں آنے والی انقلابی کامیابیاں بیان کی گئی ہیں۔ اس طرح ''بجلی کی کہانی'' میں اب سے تقریباً پچیس سو برس قبل یونان کے ایک باشندے تھیلس سے لے کر عہد حاضر تک کے ارتقائی مراحل کو آسان زبان میں پیش کیا ہے اور ان تجربات کو تصویروں کی زبانی بھی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

اس آسان اور عام فہم ترجمے کے لیے مترجم شبانہ اسلام مبارکباد کی مستحق ہیں اور امید ہے کہ یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی دوسری کتابوں کی طرح مقبول ہوگی۔

1857: جنگِ آزادی کا درخشاں باب

مرتب: ڈاکٹر ابرار رحمانی

صفحات: 274، قیمت: -/135 روپے

ناشر: پبلی کیشنز ڈویژن، وزارت اطلاعات ونشریات حکومت ہند، سوچنا بھون، سی جی او کمپلکس، نئی دہلی-3

مبصر: ابوظہیر ربانی، شعبۂ اردو، دیال سنگھ کالج، لودی روڈ، نئی دہلی-3

1857 کی بغاوت ایک ایسا عظیم واقعہ ہے جسے عالمی تاریخ میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اس میں باغیوں کو کامیابی تو نہیں ملی لیکن 15 اگست 1947 کی آزادی کی جڑیں 1857 کی اس بغاوت میں پیوست تھیں۔ انگریزوں کے جبر وتشدد کے خلاف چھوٹی بڑی شورشوں کا سلسلہ جنگ پلاسی کے بعد سے شروع ہوگیا تھا، جسے طاقت کے ذریعے دبایا جاتا رہا۔ ٹیپو سلطان کی شہادت تک جو جنگیں انگریزوں سے لڑی گئیں، ان کی سربراہی حکمراں طبقے نے کی۔ لیکن 1857 کی جنگ میں عوام بھی انگریزوں کے خلاف کمربستہ ہوگئے۔ انگریزوں کے خلاف ہندستانیوں کی یہی وہ متحدہ جنگ تھی جس نے آگے چل کر ان میں قومی شعور اور سیاسی احساس پیدا کیا اور آخرکار انھیں انگریزوں کی غلامی کا طوق اتار پھینکنے میں کامیابی بخشی۔

1857 کے ڈیڑھ سو سالہ جشن کے موقعے پر سرکاری اور غیر سرکاری سطحوں پر متعدد پروگرام منعقد کیے گئے، رسائل کے خاص نمبر یا کتابیں شائع کرکے 1857 کے شہدائے وطن کو خراج عقیدت پیش کیا گیا، اس سے 1857 کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ زیرنظر کتاب اسی سلسلے کی ایک اہم کتاب ہے۔ اس کتاب 1857 کی تحریکِ آزادی کے مختلف پہلوؤں پر معتبر دانشوروں کے 22 مضامین ہیں جو اس سے پہلے ماہنامہ ''آجکل'' میں شائع ہوچکے ہیں۔ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ ''تاریخ کے جھروکے سے'' ہے اور دوسرا ''ادب اور صحافت کے آئینے میں''۔ ابرار رحمانی نے آغاز میں ''احوال واقعی'' کے عنوان سے طویل دیباچہ قلمبند کیا ہے، جس میں 1857 کے پس منظر کی جامع تصویر کھینچی ہے اور ان غداران وطن کا ذکر بھی کیا ہے جنھوں نے استخلاصِ وطن کی راہ میں روڑے اٹکائے۔

پروفیسر ظفر احمد نظامی نے ''ہندستان کی پہلی جنگ آزادی میں دلی کا کردار'' میں 1608 میں شہنشاہ جہانگیر کی حکومت میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو ایک چارٹر کے ذریعے ہندستان میں تجارت کی اجازت دیے جانے سے لے کر بہادر شاہ ظفر کے انتقال تک کے واقعات کو موثر انداز میں رقم کیا ہے۔ ڈاکٹر رضوان قیصر نے ''1857 کی بازگشت'' میں کہا ہے کہ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ 1857 کی جنگ آزادی ناکام رہی لیکن تاریخ میں بے شمار ایسی مثالیں ملتی ہیں جہاں کسی مہم کی کامیابی اسی وقت دیکھنے کو نہ ملی لیکن اس نے آئندہ وقتوں کے لیے راہیں ہموار کردیں۔ ''پہلی جنگِ آزادی میں علما کی قربانیاں'' اس اعتبار سے اہم ہے کہ 1857 سے قبل اور مابعد اس جنگ میں علما نے جو قربانیاں دیں، سلمان علی خاں نے ان کا مفصل ذکر کیا ہے۔ 1857 کی جنگ آزادی میں جنرل بخت خاں کے قائدانہ رول اور ان کی قربانیوں سے تاریخ کا ہر طالب علم واقف ہے۔ مرحوم پروفیسر نثار احمد فاروقی نے تاریخی حوالوں سے بخت خاں کی شخصیت اور 1857 میں ان کے رول کو پیش کیا ہے۔ ہارون خاں شیروانی نے اپنے مقالے میں معاصر منابع کی نشاندہی کی ہے جو تاریخ کے طلبہ کے لیے بے حد اہم ہے۔ عام طور سے 1857 کے حوالے سے جنوبی ہندستان کے واقعات پس پردہ رہ جاتے ہیں۔ نصیرالدین ہاشمی نے 1857 میں ''حیدرآباد ریزیڈنسی پر حملہ'' کے عنوان سے مضمون لکھ کر اس کمی کی تلافی کی ہے۔

اردو ادب نہ صرف ہندستانیوں کے جمالیاتی تصور کا آئینہ دار ہے بلکہ ہر دور میں یہاں کی تہذیبی، تاریخی اور ثقافتی تبدیلیوں کا شاہد بھی رہا ہے۔ 1857 جیسے اہم واقعے کی بازگشت شاید اردو سے زیادہ کسی اور زبان میں نہیں سنائی پڑتی ہے۔ چنانچہ 1857 کے واقعے کے بعد مختلف اردو ادیبوں کی تحریروں میں اس انقلاب عظیم کی تصویریں واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہیں۔ غالب، سرسید احمد، محمد حسین آزاد، ظہیر دہلوی اور متاخرین میں راشد الخیری، خواجہ حسن نظامی وغیرہ کی تحریریں اس کی مثال ہیں۔ پروفیسر محمد حسن نے اسی حوالے سے اپنے مضمون ''1857 کی ادبی اہمیت'' میں بحث کی ہے۔ اس زمانے میں پڑھے لکھے طبقے کی زبان عموماً فارسی تھی۔ اس اعتبار سے فارسی تحریروں خصوصاً معاصر فارسی اخبارات کی اہمیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ خاص طور سے لال قلعے سے شائع ہونے والے اخبار ''سراج الاخبار'' میں مجاہدین اور بہادر شاہ ظفر کے معاونین کی تمام سرگرمیوں کی تفصیلات ملتی ہیں۔ اسی طرح ''سلطان الاخبار'' اور ''اخبار دوربین'' نے آزادی کی چنگاری کو شعلہ بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اخلاق احمد

آہن کے مضمون کا موضوع بھی اخبارات ہیں۔ کتاب میں راقم الحروف کا بھی ایک مضمون بعنوان ''انقلاب 1857 اور غالب کا ردِّعمل'' شامل ہے۔

مذکورہ مضامین کے علاوہ دتی کے حوالے سے مشیر الحق بحری آبادی، آغا حسن حیدر مرزا اور غلام احمد فرقت، لکھنؤ، ناگپور، میوات اور کشمیر کے حوالے سے بالترتیب تصدق حسین، مشرف الدین ساحل، نصیرالدین ازہر اور رحمٰن راہی کے مضامین لائق مطالعہ ہیں۔

کتاب کے مرتب ڈاکٹر ابرار رحمانی نے موضوعات کا لحاظ کرتے ہوئے مضامین کی ترتیب بڑی خوبی سے کی ہے۔ یہ کتاب تاریخ اور ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک بہترین تحفے سے کم نہیں۔

مولانا عبدالسلام ندوی: ماہر قرآنیات و ادبیات

مصنف: ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی

صفحات: 168، قیمت: 150 روپے

ناشر: مولانا عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن، 8۔ پہلا منزلہ، ہندوستانی بلڈنگ 2/10 ٹی پی اسٹریٹ، ممبئی-400004

مبصر: محمد جابر زماں، 134 ستلج ہوسٹل، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی-67

مولانا عبدالسلام ندوی مولف ''شعرالہند'' کا شمار شبلی کے ان عزیز شاگردوں میں ہوتا ہے جنھوں نے شبلی کے افکار و نظریات کو آگے بڑھانے میں حصہ لیا اور دارالمصنفین اعظم گڑھ کے ایک مخلص رکن کی حیثیت سے اپنی زندگی وقف کردی۔ زیر تبصرہ کتاب ندوی صاحب کے انھی نقوش کی شیرازہ بندی اور تعارف سے عبارت ہے۔ شعبۂ اسلامیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے منسلک کتاب کی اشاعت ''مولانا عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن، ممبئی'' کی جانب سے ہوئی ہے جس کے ذمے داروں میں معروف اسکالر پروفیسر کبیر احمد جائسی کی شمولیت اس کی ثقاہت کے لیے کافی ہے۔ ساتھ ہی محمد ہارون صاحب بھی لائق مبارک باد ہیں جنھوں نے مولانا ندوی کی خدمات کے تعارف کا بیڑا اٹھایا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں علوم قرآن اور عربی زبان و ادب سے متعلق مولانا ندوی کی خدمات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ گرچہ دوران بحث اردو کے حوالے بھی در آئے ہیں، جن کی حیثیت ضمنی ہے۔ کتاب کا آغاز مقدمۂ مصنف سے ہوتا ہے جس میں مشمولات کا تعارف ہے۔ اس کے بعد کتاب پانچ عناوین میں منقسم ہے۔

پہلا عنوان ''مولانا عبدالسلام ندوی کی قرآن فہمی'' ہے۔ جس میں مصنف نے قرآنیات کے حوالے سے ندوی صاحب کے دس سے زائد مقالات کی روشنی میں اپنی معروضات پیش کی ہیں۔ جنھیں مختلف ذیلی عنوانات مثلاً قرآن کی سات قرأتیں، معجزۂ قرآن، خصائص قرآن (قرآن و سجع)، تحریف یہود اور قرآنی قصے وغیرہ میں تقسیم کیا ہے۔ معجزۂ قرآن پر بحث کرتے ہوئے ندوی صاحب کے افکار کا بہترین تعارف پیش کیا گیا ہے۔ خصوصاً قرآن کے فکری اور روحانی معجزہ ہونے پر زور اور نجاشی کے دربار میں جعفر طیارؓ کی تقریر سے استدلال۔ مصنف نے خود کو صرف مولانا کے افکار کے تعارف تک ہی محدود نہیں کیا ہے بلکہ جہاں ضرورت سمجھی ہے وہاں دلائل کی روشنی میں مولانا سے اختلاف بھی کیا ہے۔

دوسرا عنوان ''ندوی صاحب اور عربی زبان و ادب'' ہے۔ مولانا ندوی کو قدیم (جاہلی) و جدید عربی ادب پر عبور تھا۔ جدید عربی ادب سے آگاہی کے لیے وہ عربی رسائل سے ہمیشہ اپنا تعلق استوار رکھتے تھے اور بعض اہم مقالات کو اردو میں منتقل بھی کیا کرتے تھے۔ یہ بحث تین ذیلی عنوانات پر مشتمل ہے، جس میں سب سے پہلے مولانا کی غیر مطبوعہ تصنیف ''شعرالعرب'' کے ایک مطبوعہ جزو کے حوالے سے بحث کی گئی ہے، جو جاہلی عربی شاعری سے متعلق ہے۔ یہ شبلی کی ایما پر تصنیف کی گئی تھی۔ ندوی صاحب نے شراب و کباب اور جاہلی شعرا کے حوالے سے لکھا تھا کہ ان کے یہاں ان چیزوں کا ذکر کم ہے جسے اصلاحی صاحب نے خلاف واقعہ کہا ہے۔ مصنف نے اس بحث کے ضمن میں اور اس سے قبل بھی اشعار کے جو تراجم دیے ہیں وہ سرسری طور پر انتخاب کر لیے گئے ہیں۔

شاعری کے حوالے سے مولانا کے قول ''نزول قرآن کے بعد شاعری ذلیل ہوگئی'' کے حوالے سے مصنف نے اچھی بحث کی ہے۔ دراصل قرآن شاعری کو شہر بدر نہیں کرنا چاہتا بلکہ صرف احتساب پر زور دیتا ہے اور ایسی شاعری جو اس کی فکر سے متصادم ہو اسے رد کرتا ہے۔

جامعہ ازہر کے عنوان سے اس کے انحطاط اور تجدید و اصلاح کے ضمن میں محمد عبدہٗ اور رشید رضا مصری کی کوششوں اور ان کی بنا پر ہوئی تبدیلیوں سے اردو داں طبقے کو متعارف کرانے کے لیے ندوی صاحب نے عربی تحریروں کے جو تراجم کیے ہیں یہ حصہ ان کے تعارف پر مشتمل ہے۔ ندوی صاحب نے انحطاط پر بحث کرتے ہوئے نصاب تعلیم کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ اس کے بعد ''تراجم کتب'' کے عنوان سے مولانا ندوی کی ترجمہ کردہ پانچ کتابوں کا تعارف ہے۔ جس میں فلسفہ ابن خلدون، التربیۃ الاستقلالیہ، انقلاب امم، فطرت نسوانی اور تاریخ فقہ اسلامی شامل ہیں۔

تیسرا عنوان ''تصوف مولانا ندوی کی نظر میں'' ہے۔ جس میں مولانا کے تین مقالات تصوف کا اسلام سے رشتہ، صوفیانہ نظام اخلاق اور تصوف کی تجدید و اصلاح پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ندوی صاحب نے تصوف کا معروضی مطالعہ کیا ہے اور وحدۃ الوجود، اصحاب الصحو اور اصحاب سکر کے حوالے سے بحث کی ہے اور اسے ایرانی و ہندوستانی تہذیب و فکر سے متاثر بتایا ہے۔

چوتھا عنوان ''مکاتیب عبدالسلام ندوی کے بنیادی نکات'' ہے جس میں

چند خطوط کی روشنی میں ان کی تصانیف سے متعلق چند معلومات اکٹھا کی گئی ہیں۔ ''اقبال کامل'' سے متعلق سید عبداللہ اور نذیر نیازی وغیرہ کو لکھے گئے خطوط کے حوالے سے مولانا ندوی کی تحقیقاتی روش کو متعارف کرایا گیا ہے۔ ندوۃ العلما اور شبلی کے حوالے سے بھی چند باتیں کی گئی ہیں۔ غیر مطبوعہ تصانیف کے عنوان سے خطوط کی مدد سے کچھ کتابوں کے متعلق اطلاع دی گئی ہے جن میں کچھ کے مسودات موجود ہیں اور کچھ کا پتہ نہیں۔

پانچواں اور آخری عنوان ''مولانا عبدالسلام ندوی کا تغزل'' ہے جس کے تحت چند اشعار پیش کیے گئے ہیں۔ کیوں کہ مولانا کے کلام میں ایک فارسی غزل اور پندرہ اردو غزلیات ہی دستیاب ہیں۔ اس سے ہمیں یہ علم تو ہو جاتا ہے کہ مولانا شاعر تھے لیکن اس حصے سے مولانا کی شخصیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ایک دو شعر آپ بھی دیکھیں:

ہوا مرنے پر آغاز محبت
شروع ہوتا ہے یہ قصہ یہیں سے
یوسف کو سستے دام زلیخا نے لے لیا
تقدیر تھی کہ حسن کی قیمت ٹھہر گئی

اس کتاب کا مقصد نئی نسل کو مولانا کی تحریروں سے متعارف کرانا اور ان کے مطالعے کی جانب راغب کرنا ہے جس میں یہ کامیاب ہے۔ طباعت دیدہ زیب ہے مگر پروف پڑھنے میں احتیاط نہیں برتی گئی ہے جس کی بنا پر چند غلطیاں راہ پاگئی ہیں۔

لاگ لپیٹ کے بغیر

مصنف: پروفیسر مظفر حنفی
صفحات: 150، قیمت: -/160 روپے
ناشر: مکتبہ جدید، نئی دہلی-110002
مبصر: ڈاکٹر ممتاز الحق، E-227، ابوالفضل انکلیو-II، نئی دہلی-110025

''لاگ لپیٹ کے بغیر'' پروفیسر مظفر حنفی کے مضامین کا مجموعہ ہے جس میں کل سترہ مضامین شامل ہیں ابتدائی دس مضامین مقالات کے ذیل میں رکھے گئے ہیں بقیہ سات تاثراتی مضامین کے تحت۔ ان مضامین کے موضوعات میں کافی تنوع ہے اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ تقریباً سبھی مضامین کسی فرد یا ادارے کی فرمائش پر لکھے گئے ہیں۔

پیش لفظ میں مصنف نے اپنا تنقیدی موقف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''میں چونکہ پیشہ ور نقاد نہیں ہوں اس لیے عموماً ایسے موضوعات پر قلم نہیں اٹھاتا جو ہمارے ناقدین کو بہت محبوب ہیں نہ ہی ان لکھنے والوں کی ستائش پر آمادہ ہوتا ہوں جنھیں تنقید نے پہلے ہی بلند کرسیوں پر فائز کر رکھا ہے۔ میرے موضوعات اکثر نئے اور گوشے اچھوتے ہوتے ہیں۔ غور کیجیے تو میرے ہاں آپ کو اسالیب بیان میں بھی تنوع کا احساس ہوگا۔ اکثر بات کہنے کے لیے میں تنقیدی نثر میں بھی نئے انداز اور تازہ تکنیک اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

موضوعات میں تنوع کا اندازہ کتاب کے چند عنوانات سے لگایا جاسکتا ہے۔ جوش لفاظ یا لفظوں کا نباض، آسماں محراب: ایک جائزہ (شمس الرحمٰن فاروقی کا شعری مجموعہ) کوثر چاند پوری شعلۂ سنگ کی روشنی میں، طنز اور بسمل سعیدی، عین تابش کی نظمیں، شفا گوالیاری کا فن، رشک فارسی پر ایک نظر (شجاع خاور کا شعری مجموعہ)، پروفیسر احتشام حسین کی وفات پر، بہت اچھا دوست اور شاعر: عشرت قادری، مشاعروں میں ہمارا نمائندہ راحت اندوری، کھنڈر وہ میرا شہر آرزو، یاد ایام بنام تاجدار احتشام وغیرہ۔

مظفر حنفی کے انداز تحریر کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیں:

''ہر چند کہ جوش نے شاعری کی ابتدا غزل سے کی، لیکن سلیم پانی پتی کے مشورے کو قبول کر کے نظم گوئی کی جانب ایسے مائل ہوئے کہ آگے چل کر علی الاعلان غزل سے بیزاری کا اعلان کرنے لگے (پانی پت کے میدان میں غزل تہہ تیغ ہوتی آئی ہے جس کی شہادت ہمارے پہلے باقاعدہ نقاد حالی دے سکتے ہیں۔)''

''رشک فارسی، پر ایک نظر'' میں طنز کی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''اگر ان شعروں سے طنز اور لہجے کی عقربی نیشیں نکال دیں تو یہ بکھوے جیسے لجلجے اور سادہ بیانات رہ جائیں گے۔''

جوش پر یہ الزام اکثر لگایا گیا ہے کہ ان کی شاعری نری لفاظی ہے۔ مظفر صاحب نے جوش کی رباعیات کا تجزیہ کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ جوش صحیح معنوں میں لفظوں کے نباض تھے، ان پر لفاظ ہونے کا الزام نہیں لگایا جاسکتا۔

'لاگ لپیٹ کے بغیر' واقعتاً دوٹوک رائے کی حامل ہے۔ مصنف نہ تو کسی شخصیت سے مرعوب نظر آتا ہے اور نہ وہ مصلحت سے کام لیتے ہوئے دل کی بات چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ ان مضامین کا انداز شگفتہ اور رواں دواں ہے اور ان کی سادگی، سچائی اور بے تکلفی قاری کو متاثر کرتی ہے۔

مثنوی: جہاں دار شاہ و شہزادی حور

مصنف: کشن دیب بہادر کنور
مرتب: ڈاکٹر ابوبکر جیلانی
صفحات: 153، قیمت: -/200 روپے
ناشر: اثبات و نفی پبلی کیشنز، 89/5، رپن اسٹریٹ، شبلی ہاؤس، کولکاتا-16
مبصر: درخشاں زریں، لکچرار شعبۂ اردو، خضر پور کالج، خضر پور، کولکاتا-23

مثنوی ''جہاں دار شاہ و شہزادی حور'' مصنف کشن دیب بہادر کنور، تحقیق و ترتیب ڈاکٹر ابوبکر جیلانی طویل مقدمے کے ساتھ حال ہی میں منظر عام پر آئی ہے۔

کشن دیب بہادر کنور (1815-1867) کو شاعری وراثت میں ملی تھی۔ اردو، فارسی، عربی اور بنگلہ زبان میں اچھی لیاقت ان کی خاندانی تعلیم و تربیت کی دین تھی۔ کنور ایک ایسے بنگالی شاعر ہیں جنھیں دربار دہلی کا شاہی شاعر ہونے کا شرف حاصل رہا۔ ان کی تصانیف میں زیر تبصرہ مثنوی کے علاوہ ایک اور مثنوی ''شاہ جہاں و نور جہاں''، چار جلدوں میں ''شاہنامۂ ہند'' (فارسی) اور اردو دیوان بھی ہیں جو امریکن اورینٹل سوسائٹی، خدابخش لائبریری اور ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں دستیاب ہیں۔ مثنوی ''جہاں دار شاہ و شہزادی حور'' مرتب کتاب نے ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال سے حاصل کی ہے جس پر سنہ تصنیف 1848 درج ہے۔

''مثنوی کنور — جہاں دار شاہ و شہزادی حور'' چھ عنوانات پر مشتمل ہے۔ (i) تعارف (ii) پیش نامہ (iii) عہد کنور (iv) حیات کنور (v) مثنوی کا قصہ، اور (vi) مثنوی — ''تعارف'' میں اپوروا کرشنا نے مثنوی کی قدر و قیمت اور مرتب کی کاوش و جستجو سے بحث کی ہے، ''پیش نامہ'' میں خود مرتب نے اردو مثنوی نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی پیشکش کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی ہے، ''عہد کنور'' میں کنور کی شاعری اور خصوصاً اس مثنوی کے وجود میں آنے کے ماحول و معاشرے کا سیاسی، سماجی اور فکری پس منظر پیش کیا ہے، ساتھ ہی راجہ رام موہن رائے، دیانند سرسوتی اور سرسید احمد خاں وغیرہ کی سماجی اصلاحی تحریک اور شعر و ادب پر ان کے اثرات کی نشاندہی کرتے ہوئے اردو مثنویوں میں مروجہ قصوں سے کنور کے گریز اور بدلتے حالات سے ان کے تحرک پانے کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ ''حیات کنور'' میں کنور کی زندگی، تعلیم اور تصانیف کا ذکر ہے، ''مثنوی کا قصہ'' مذکورہ مثنوی پر 41 صفحات میں ایک طویل مقدمہ ہے اور اس کے بعد مثنوی کا اصل متن شروع ہوتا ہے جو صفحہ 63 سے شروع ہوکر 153 پر ختم ہوتا ہے۔

کنور نے مثنوی کی ابتدا اپنے ہندو عقیدے کے مطابق بھگوان کشن جی کی شان میں قصیدے سے کی ہے۔ پھر حمد باری تعالیٰ اور مرزا ابوظفر سراج الدین بادشاہ کا قصیدہ ہے، اس کے بعد مثنوی کا اصل قصہ شروع ہوتا ہے جو ''رزمیہ'' اور ''رومانی'' دو حصوں میں منقسم ہے۔ رزمیہ میں دولت و ثروت کی حصولیابی اور حکومت و اقتدار میں حصے داری کی ہنرمندی سے آگاہی ہوتی ہے اور رومانی حصے میں جسے مرتب نے حکمراں طبقے کی رومانی زندگی کے حسین و رنگین لمحات کا آئینہ دار کہا ہے، پرستان کا طلسماتی ماحول، رومان انگیز کیفیات اور حسن و عشق کے معاملات، جام و مینا سے شغل جیسے ماحول و مناظر کی تصویر کشی کی ہے جس میں قاری کی دلچسپی اور تجسس ہر لمحہ قائم رہتا ہے۔ اردو مثنویوں میں کنور کی اس مثنوی کے معیار پر مرتب کتاب ڈاکٹر ابوبکر جیلانی نے اچھی بحث کی ہے جو اس مثنوی کا اصل معیار متعین کرنے میں معاون ہے۔

بے تیشہ

شاعر: ڈاکٹر اختر صدیق

صفحات: 144، قیمت: -/100 روپے

ناشر: رنگ پبلی کیشنز، تجوا، دھنباد-828121

مبصر: فیاض احمد وجیہہ، 117 شیخ ہاسٹل، جے. این. یو. نئی دہلی-110067

شاعری زندگی اور اس کے مختلف مظاہر کا آئینہ ہے۔ اس میں سماجی تفاعل اور باطنی کرید کے کئی ایسے مقام ہیں جو نئے بھیدوں کا سراغ دیتے ہیں۔ اختر صدیق کی شاعری فنی و فکری تکمیل کی جانب گامزن ہے، مطالبات فکر و فن کی تکمیل اور اپنے تخلیقی جوہر کی دریافت میں ان کو دور تک سفر کرنا ہے۔ ''بے تیشہ'' ان کی غزلیہ شاعری کا پہلا مجموعہ ہے۔ جس کے سرنامے پر یہ شعر ہے:

یہ دنیا اک کوہ گراں
میں ہوں بے تیشہ فرہاد

انھوں نے اپنی غزلیہ شاعری کو بڑی سادگی سے زندگی کی داخلی اور خارجی کیفیات و واردات کا ترجمان بنایا ہے۔ بیان کی سادگی ہی ان کے اشعار کا حسن ہے۔ مگر انھوں نے تہہ داری پیدا کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ اس طور پر ان کے اولین شعری مجموعے سے ہی ان کے ستھرے ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔

اختر صدیق اپنی شاعری کے تعلق سے واضح اور مرتب نظریہ بھی رکھتے ہیں:

''زندگی مجھے جس رنگ میں ملی اور جن حالات و کیفیات سے میں گزر رہا ہوں، ان کی ہو بہو تصویر اور بے لاگ اظہار ان غزلوں میں موجود ہے۔ یہ غزلیں میری ذاتی زندگی کی داستان اور عصری حسیت کی ترجمان ہیں۔'' [ص۔9]

ان کی پوری شاعری اسی تمہید کی تعبیر و تصریح ہے۔ ان کے یہاں حسیت کی کئی جہتیں ہیں۔ جو ان کے بیان کو اعتبار کا درجہ عطا کرتی ہیں۔ انھوں نے نئے اسالیب وضع کرنے اور اجتہاد و انحراف سے زیادہ اپنی شعری روایات پر غور کیا ہے، اسی کے باعث کلاسیکی اسالیب بیان میں بھی وہ عصری حسیت کو پیش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کے یہاں توڑ پھوڑ اور شکست و ریخت کا کوئی عمل نہیں ہے۔ انھوں نے بعض عقائد اور فرسودہ روایات کو طنز کا نشانہ بھی بنایا ہے۔ ان کی لفظیات اور تراکیب، روزمرہ اور کلاسیکی شعری روایات کی بازدید ہیں۔ وہ عام بول چال کے ایسے الفاظ بھی جو ہندی سے اردو میں آرہے ہیں، بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔

اختر صدیق چونکہ عرفان نفس کے داعی ہیں، اس لیے ان کی شاعری میں

''میں'' اور اس کا پھیلا ہوا تجربہ اور مشاہدہ اہم ہے۔ ان کے ہاں قاری سے گفتگو کرنے کا انداز اور خود کلامی کی جو صورتیں ہیں، انھیں ان کے کلام کی بنیادی خصوصیت کہا جاسکتا ہے۔ اختر صدیق اپنے اولین نقش میں ہی اپنے شعری امکانات کو بروئے کار لانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

موجِ شمیم

شاعر: شمیم جے پوری

مرتب: پروفیسر ظفر احمد نظامی

صفحات: 303، قیمت: -/250 روپے

ناشر: لبرٹی آرٹ پریس، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دریا گنج، نئی دہلی-110002

مبصر: عبدالرشید راشد اعظمی، کاویری ہاسٹل، جے۔ این۔ یو، نئی دہلی

شمیم جے پوری کو کافی عرصہ پہلے ایک مشاعرے میں سننے کا موقع ملا تھا۔ دھندلی سی یاد اب بھی باقی ہے۔ مجموعے کی ورق گردانی کرتے وقت نظر ایک ایسی منزل پر رکی کہ اعظم گڑھ کا وہ مشاعرہ یاد آ گیا۔ شمیم جے پوری مکمل روایتی شاعرانہ حلیے میں مائک کے سامنے کھڑے بلند ترنم آواز میں غزل سرا تھے:

سوزِ دل سوزِ جاں سوزِ غم زندگی
اصل میں اب ہوئی ہے اہم زندگی

ان کی سحر انگیز آواز نے مبہوت و مسحور کر دیا تھا۔ ''موجِ شمیم'' کے مطالعے سے اندازہ ہوا کہ شمیم کی شاعری میں صرف غمِ جاناں کی حسن کاری ہی نہیں ہے ان کے کلام میں جا بہ جا دنیا کے رنج والم بھی ہیں۔ شمیم کے نزدیک بے فکر اور غموں سے آزاد زندگی بے لطف و بے کیف ہے۔ ان کی شاعری بظاہر روایتی انداز و اسلوب کی پابند ہے۔ تاہم کہنہ و فرسودہ مضامین کی تکرار سے آزاد ہے۔ ان کی شاعری روایت کی پاسداری کے ساتھ ساتھ جدید دور کے تقاضے بھی پورے کرتی ہے۔ موجودہ دور میں پیش آنے والے واقعات و سانحات کو قلبی واردات سے ہم آہنگ کرنا، دلِ گداختہ کی وارفتگی کو حرارت عطا کرنا اور قاری و سامع کے ذہن کو مہمیز کرنا، ان کے اندر تحرک پیدا کرنا شمیم کا خاص اسلوب ہے۔ لہجے کی اثر انگیزی اور الفاظ کا حسنِ انتخاب شمیم کا نمایاں وصف ہے۔ یہ اوصاف ان کے لیے تسکین قریشی اور جگر مرادآبادی کی دین کہے جاسکتے ہیں۔ اس کا اعتراف شمیم نے خود کیا ہے:

ہم تو تسکین و جگر کے ہیں پرستار شمیم
یوں تو دنیا میں بہت ہم نے سخنور دیکھے

شمیم کی غزلوں میں جگر کی تپش جذبات، سرشاری، والہانہ پن اور اثر انگیزی کے ساتھ تسکین کی دبی ہوئی شرر باری، عشق کی سنجیدگی و متانت اور پاسِ ناموسِ عشق ہے۔ والہانہ پن کے ساتھ ساتھ شعور کا عکس بھی ہے۔ شمیم، جگر و تسکین کے پرستار ضرور ہیں لیکن نرے مقلد نہیں۔ ان کی شاعری کلاسیکیت اور جدیدیت کے امتزاج سے متصف ہے۔ وہ دیدۂ بینا رکھتے ہیں اور شب و روز پیش آنے والے واقعات اور عصرِ حاضر کے مسائل سے مواد کشید کرتے ہیں۔ اس مقام پر پہنچ کر منفرد اسلوب و آہنگ کے مالک نظر آتے ہیں، جس میں دل و دماغ اور عقل و جنوں متوازی چلتے ہیں۔

کلاسیکیت یا روایت کوئی جامد شے نہیں ہے اور نہ ہی اس کی ویلی ڈیٹی کسی مخصوص زمانی حد پر ختم ہوتی ہے۔ ہر آنے والے زمانے کی جڑیں اپنے ماضی میں پیوست ہوتی ہیں، وہیں سے ان کی آبیاری ہوتی ہے۔ حال کے گوناگوں مسائل اور تجربات سے فنکار کے ذہن میں وسعت و تنوع پیدا ہوتا ہے اور ہر فن پارہ اپنے دور کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ وہ شاعری جس میں شاعر کے مشاہدات اور تجربات کا اظہار اس طرح ہو کہ قاری یا سامع کو انبساط کے ساتھ کوئی سبق بھی ملے، روح میں تڑپ پیدا ہو، سماج کے تئیں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو ایسی شاعری زندہ شاعری ہوگی۔ بقول شمیم جے پوری:

''اگر غزل اپنے دور کی تہذیبی اقدار کی ترجمان نہیں اور پر اثر انداز میں شاعر کے جذبات کی حامل نہیں تو اسے سچی شاعری نہیں کہا جاسکتا''

شاعری کو صرف ذاتی تجربات کے اظہار کا ذریعہ بنانا، خود بینی و خود نمائی اور فنی خیانت ہے۔ شمیم کے نزدیک زمانے کا دکھ درد اپنا دکھ ہے۔ وہ اپنے ماحول اور گرد و پیش سے واقف ہیں:

اپنے ہمسائے کے گھر جاکے اماں لے لیتا
وہ بھی میرا ہی سا بے گھر ہے، پکاروں کس کو

شمیم اس درجہ حساس ہیں کہ خود کو انسانی انبوہ میں تنہا محسوس کرتے ہیں۔ ان کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سب نے شکلیں بدل رکھی ہیں۔ حقیقت کچھ ہے اور اظہار کچھ اور ہے۔ ان محسوسات کو شمیم نے اپنے لفظوں میں سادہ و سلیس انداز میں بیان کیا ہے۔ بے اعتقادی، تلون مزاجی اور پیماں شکنی کے دور میں شمیم آزردہ خاطر ہیں۔ کہتے ہیں:

کتنی بھیڑ ہے دنیا میں
اور میں پھر بھی تنہا ہوں
تو نے بدلے کتنے رنگ
میں جیسا تھا ویسا ہوں

شمیم جے پوری کا مجموعہ ''موجِ شمیم'' اسم بامسمیٰ ہے۔ شمیم کی غزلیں ان کے مزاج اور رفطرت سے ہم آہنگ ہیں۔ مجموعے میں طویل و مختصر سب ملا کر 188 غزلیں ہیں۔ رباعیات و قطعات مستزاد ہیں۔ مجموعے کا آغاز نعتوں سے ہوا ہے، جن کی تعداد چھ ہے ایک سلام بھی ہے۔

لسانی کھیل

مصنف: ڈاکٹر غضنفر

صفحات: 128، قیمت: -/135 روپے

ناشر: مصنف، بشریٰ پبلی کیشنز، بشریٰ حمزہ کالونی، نیو سر سید نگر، علی گڑھ

ڈاکٹر غضنفر تقریباً تین دہائیوں سے اردو تعلیم و تدریس سے منسلک ہیں۔ انھوں نے اپنے تجربے سے اس کتاب میں کھیل کھیل میں بچوں کو وہ چیزیں سکھائی ہیں جن میں ان کی دلچسپی ہو۔ کہا جاتا ہے کہ تعلیم صرف علم سکھانا ہی نہیں بلکہ بچوں کی دلچسپیوں، آرزوؤں اور فطرت کے مطالعے کے ساتھ ان کی تربیت کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ لہٰذا انھوں نے بچوں کی نفسیات اور ان کی دلچسپی کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ لسانی کھیل تیار کیا ہے اور زبان کی تحریری شکل پر خاص توجہ دی ہے۔

''لسانی کھیل'' کل تیس کھیل (مشق) پر مشتمل ہے جن میں حروف سے الفاظ کی ساخت، خانوں میں دیے گئے بکھرے حروف سے الفاظ کی ساخت، دی گئی کہانیوں، عبارتوں اور اشعار کے درمیان خالی جگہوں پر صحیح الفاظ پر کرنا، بیت بازی کے طریقے، شعر سن کر شاعر کا نام بتانا، کتاب کے مصنف اور مصنف کی کتاب کا نام بتانا، دائروں سے الفاظ چن کر بنی ہوئی تصویروں کے نیچے خالی خانوں میں ان کے نام بھرنا جیسی مشق کرائی گئی ہے۔ ہم صوت الفاظ سے شناسائی اور رسم خط سے لے کر زبان و بیان اور تاریخ گوئی تک کا کچھ اس انداز سے بیان ہے جو بچوں میں ادبی ذوق، شعر فہمی، حاضر جوابی اور تخلیقی قوت کو ابھارنے میں معاون ہو۔ ''کھیل'' کے آخر میں مشق میں پوچھے گئے سوالات کے جواب بھی دے دیے گئے ہیں۔ کتاب کے ابتدائی پانچ صفحات میں ڈاکٹر علی رفاد فتیحی کا ''پیش لفظ'' اور مصنف کی معروضات ہیں۔ یہ کتاب جدید طرز تعلیم و تدریس کے تحت لکھی گئی ہے۔ حروف اور تصاویر رنگین اور دلکش ہیں۔

اردو لوک ادب میں خواتین کا حصہ

مصنف: عبداللہ امتیاز احمد

صفحات: 214، قیمت: -/250 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، کوچہ پنڈت، گلی وکیل، لال کنواں، دہلی-6

لوک ادب کا ہمارے سماج اور معاشرے سے گہرا رشتہ ہے۔ سیدھے سادے عوام کے دلوں سے نکلے ہوئے وہ احساسات و جذبات جو لسانی پابندیوں سے آزاد ہوتے ہیں اور اس کے تخلیق کار اکثر گم نام ہوتے ہیں۔ یہ ادب غیر منظم طریقے سے سینہ بہ سینہ چلا آرہا ہے جو ہمارے قدیم سماج اور تہذیب کا آئینہ ہے۔ اس میں ہماری اجتماعی خوشیاں اور اجتماعی غم دونوں شامل ہوتے ہیں۔ ایک زمانے تک اس جانب اہل ادب نے توجہ نہیں کی تھی لیکن اب منظم طریقے سے لوک ادب کے تحفظ کا کام کیا جارہا ہے اور بہت حد تک سرکاری سرپرستی بھی اسے حاصل ہورہی ہے۔ اس لوک ادب میں گیت، ڈرامے، پہیلیاں، کہاوتیں اور قوالی وغیرہ شامل ہیں۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر لوک گیتوں کی دھنیں بڑی دلچسپی سے گائی اور سنی جاتی ہیں۔ ان گیتوں کی سب سے بڑی محافظ عورتیں ہیں جن سے یہ سرمایہ نسل در نسل منتقل ہوا ہے۔ اس فن میں عورتوں کو اختصاص حاصل ہے اور اسی اختصاص کو اس کتاب میں واضح کیا گیا ہے۔

کتاب چار ابواب اور بارہ ضمنی ابواب پر مشتمل ہے۔ سات صفحات میں پیش لفظ ہے اور آخر میں کتابیات بھی دی گئی ہے۔ طباعت اور بائنڈنگ اچھی ہے۔

رمز معانی

مرتب: ڈاکٹر محمد ارشد خاں اعظمی

صفحات: 160، قیمت: -/200 روپے

ناشر: مصنف، رہبر منزل، خالص پور، اعظم گڑھ، اتر پردیش

''رمز معانی'' میں ڈاکٹر محمد ارشد نے نشور واحدی کے تنقیدی مضامین کو یکجا کیا ہے۔ اس سے قبل محمد ارشد، نشور واحدی کی شاعری اور شخصیت پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ چکے ہیں، جن پر انھیں ڈاکٹریٹ کی سند تفویض کی جا چکی ہے۔ انھوں نے نشور واحدی کے فرزند نیاز واحدی کے تعاون سے مضامین جمع کیے ہیں۔ یہ وہ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مضامین ہیں جو نشور صاحب نے وقتاً فوقتاً تحریر کیے ہیں۔ ان میں تبصروں اور خطوط کے ساتھ وہ مقدمے بھی ہیں جو دوسروں کی کتابوں پر لکھے گئے ہیں۔ نشور صاحب کا خاص موضوع فلسفہ تھا جس کی پرچھائیاں ان کی شاعری کے ساتھ ساتھ ان نثری تحریروں میں بھی نمایاں ہیں۔ فہرست مضامین کو تین حصوں میں منقسم کیا ہے پہلے حصے میں تنقیدی و تاثراتی مضامین ہیں جو اردو غزل، فانی، ندرت کانپوری، جگر، انیس، فراق، گوہر، پیام فتحپوری اور مظہر امام پر لکھے گئے ہیں، دوسرے حصے میں تبصرے ہیں جو شاد عارفی، وسیم بریلوی، عارف سیتاپوری، واجد سحری، سوز سکندر پوری اور نسیم شاہ جہاں پوری کی کتابوں پر لکھے گئے ہیں، تیسرے حصے میں نشور واحدی کے خطوط ہیں اور آخر میں نشور واحدی کی نثر پر لوگوں کی رائے دی گئی ہے، جن میں نثار احمد فاروقی، شجاعت سندیلوی، سید علی رضا حسینین، عشرت ظفر اور مرتب شامل ہیں۔

نقطۂ نظر

مصنف: ڈاکٹر محمد کلیم ضیا

صفحات: 156، قیمت: -/200 روپے

ناشر: تکمیل پبلی کیشنز، ممبئی، بھیونڈی

''نقطۂ نظر'' محمد کلیم ضیا کے گیارہ تنقیدی، تحقیقی اور تبصراتی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان میں چار کتابوں پر مفصل تبصرے ہیں، جو تنقیدی اور تحقیقی مضامین ہیں وہ مختلف سیمیناروں میں پڑھے جاچکے ہیں اور رسائل و جرائد میں بھی شائع ہوچکے ہیں۔ ان کے عنوانات بالترتیب: جگر مراد آبادی، پطرس بخاری، مضامین پطرس کی روشنی میں، الف سے اسداللہ خاں غالب، آم اور اقبال، اختر اعظمی، رگِ سنگ کے آئینے میں، فضیل جعفری کی غزلوں میں شہر، عصری غزل کا نمائندہ شاعر: مدحت الاختر، تلمیحات فیض، تاج دار تاج، آوارہ پتھروں کے درمیاں، ترقی پسند غزل کی تازہ روایت کا علمبردار مجروح سلطان پوری، شفیع ساغر کی اناپ شناپ، اور حفیظ میرٹھی کی نظم گوئی ہیں کتاب پیپر بیک میں ہے اور اچھی چھپی ہے۔

ادریس سنسہاروی اور سہیل کے اداریے

مرتب: ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی

صفحات: 208، قیمت: -/200 روپے

ناشر: اثبات و نفی پبلی کیشنز، 89/5 رپن اسٹریٹ، شبلی ہاؤس، کولکاتا-16

ادریس سنسہاروی ماہ نامہ ''سہیل'' کے مدیر تھے۔ یہ رسالہ ترقی پسند ادب کا ترجمان تھا جو ریاست بہار کے گیا شہر سے نکلتا تھا۔ اس رسالے کا اجرا ادریس صاحب کے والد مولوی عبدالرحمٰن بسمل نے 1939 میں کیا تھا۔ ادریس سنسہاروی اس رسالے سے 1957 میں وابستہ ہوئے اور اس کی ادارت 1984 تک سنبھالی۔ انھوں نے اپنے 27 سالہ دور ادارت میں نئی نسل کے ترقی پسند ادیبوں کی بھرپور رہنمائی کی۔ ادریس سنسہاروی نے ابتدا میں سہیل عظیم آبادی کے ساتھ ''تہذیب'' نام کا رسالہ اور پروفیسر شکیل الرحمٰن کے ساتھ ہفتہ وار ''زمین'' بھی پٹنہ سے نکالا تھا۔ ترقی پسند تحریک کے روح رواں سجاد ظہیر کے ساتھ بمبئی میں ترقی پسندی کے علم بردار اخبار ہفتہ وار ''قومی جنگ'' کے ادارے میں بھی رہے۔ بمبئی سے واپسی پر انھوں نے ''سہیل'' کی ادارت سنبھالی اور اسی رسالے کے ذریعے اپنی عمر کی آخری منزل تک ترقی پسند قلم کاروں کی رہنمائی کرتے رہے۔

بہار سے نکلنے والے رسالوں میں ''سہیل'' اور ''آہنگ'' نے اردو شعروادب کی خدمت میں اہم کارنامے انجام دیے ہیں۔ ''آہنگ'' کلام حیدری کی ادارت میں نکلتا تھا اور ''سہیل'' کی ادارت ادریس سنسہاروی کے ذمے تھی۔ انھوں نے اپنے دور ادارت میں ''سہیل'' کے کچھ خاص نمبر بھی نکالے جن میں بھاگل پور کا ادبی ماحول نمبر (1960)، منشی پریم چند نمبر (1980)، سہیل عظیم آبادی نمبر (1981)، کیفی اعظمی نمبر (1984)، جمیل مظہری نمبر (1985) اور کلام حیدری نمبر وغیرہ دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں۔

ادریس سنسہاروی کے ''سہیل'' کے اداریے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے اپنے اداریوں میں سیاست، ثقافت، زبان، ادب، فلم اور عام انسانی مسائل پر اپنا مطمحِ نظر بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی نے 75 اداریوں کا اصل متن پیش کرنے کے ساتھ ان پر سیر حاصل مقدمہ لکھا ہے۔ پروفیسر لطف الرحمٰن اور پروفیسر علیم اللہ حالی نے 21 صفحات میں ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی کی اس کاوش پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے اور آخر میں مرتب نے اظہار تشکر کیا ہے۔

نیوایج ویژن (پندرہ روزہ)

ایڈیٹر ان چیف: خوشتر نورانی

سینئر ایڈیٹر: ڈاکٹر خواجہ اکرام

صفحات: 72، قیمت: -/15 روپے

ناشر: نیو ایج ویژن/G-2/A، گراؤنڈ فلور، ابوالفضل انکلیو، پارٹ II، شاہین باغ، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی-110025

''نیو ایج ویژن'' دہلی سے حال ہی میں نکلنے والا پندرہ روزہ رسالہ ہے۔ پہلے شمارے کی پیش کش اور مشمولات پر ایک نگاہ ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ''نیو ایج ویژن'' اردو صحافت میں انگریزی کے ''انڈیا ٹوڈے'' کو سامنے رکھ کر نکالا گیا ہے۔ سرورق اور اندر کے صفحات رنگین اور کاغذ کوٹیڈ ہے۔ سیاست، حالات حاضرہ، معاشیات، ادب اور مذہب اس کے خاص موضوع ہیں۔ اس کے کالم ہیں— گم گشتہ ورق، ایڈیٹر کے نام، اداریہ، بیان بازیاں، مختصرات، حالات حاضرہ، انٹرویو، عالم اسلام، عالمی منظرنامہ، اقتصادیات، کور اسٹوری، فکرونظر، سائنس ٹیکنالوجی، ڈاکیومنٹری، طب وصحت، بزم خواتین، بچوں کی دنیا، کھیل، طنزومزاح اور تبصرے، ممبئی فساد 93-1992 پر جسٹس بی. این. کرشنا کے تاثرات، ادارتی ویژن، عبوری بجٹ 2009، وی ایچ پی کا علما سے احمقانہ مطالبہ، سلم ڈوگ ملینئر، جسٹس راجندر سچر سے انٹرویو، خوف نہیں امید کا انتخاب، براک حسین اوباما، ہندوستان میں دہشت گردی، راون کے کتنے سر، سیکولر ہندوستان میں مذہب، علاقہ اور زبان کی جنگ، گجرات میں مسلم کشی کی داستان کی دستاویزی فلم کا تجزیہ، وغیرہ معلوماتی ہیں اور قاری کو متوجہ کرتے ہیں۔ اردو صحافت میں اس رسالے کا اجرا ایک خلا کو پر کرتا دکھائی دیتا ہے۔

□□□

شمیم احمد صدیقی

انوکھے معمار

ہمارے ملک کے طول وعرض میں حفاظتی قلعوں، رہائشی محلوں، عبادت گاہوں، مقبروں وغیرہ کی شکل میں ایسی سیکڑوں عمارتیں ہیں جوفنِ تعمیر کا شاہکار ہیں اور جن کی دلکشی سے لطف اندوز ہونے اور حسنِ تعمیر سے واقفیت کے لیے ہر سال لاکھوں غیر ملکی سیاح آتے ہیں۔ ان عمارتوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ سیکڑوں ہزاروں کاریگروں اور مزدوروں کی محنت اور کثیر رقم صرف ہونے کے بعد ہی وہ اپنی موجودہ شکل کو پہنچی تھیں۔ مزید یہ کہ اب ان کی مرمت اور حفاظت وغیرہ پر بھی ہر سال لاکھوں روپئے خرچ کیے جاتے ہیں۔ لیکن یہ کتنے لوگ جانتے ہیں کہ ہمارے ہی ملک میں قدرت نے ایسے کاریگر بھی پیدا کیے ہیں جو بغیر کوئی اجرت لیے قلیل مدت میں درختوں کی شاخوں پر ایسے گھروندے تعمیر کر دیتے ہیں جن کو فروخت کر کے ہم ہر سال کروڑوں روپئے کا زرِ مبادلہ حاصل کرتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ کاریگر اپنے تعمیری فن کو سیکھنے کے لیے کسی استاد کے محتاج بھی نہیں ہوتے بلکہ وہ پیدائشی کاریگر ہوتے ہیں۔ مزید دلچسپ بات یہ کہ ان کی ماں ان کو جنم دینے کے بعد خود انتقال کر جاتی ہے اور اپنے مردہ جسم کے کفن دفن یا کریا کرم کے لیے کسی کو کوئی زحمت نہیں دیتی بلکہ نومولود بچے ہی اپنی مردہ ماں کے جسم کو بطور غذا استعمال کر کے اس قابل بنتے ہیں کہ خود غذا کی تلاش میں ہاتھ پیر مار سکیں۔ ان معماروں کو قدرت نے ننھے ننھے کیڑوں کی شکل میں پیدا کیا ہے، جو عرف عام میں لاکھ کے کیڑے کہلاتے ہیں۔ یہ کیڑے جو گھروندے تعمیر کرتے ہیں ان سے تیار کردہ مادے (Product) کو اس لیے لاکھ کہہ کر پکارا گیا کیونکہ لگ بھگ ایک لاکھ کیڑوں کے گھروندوں سے ایک پونڈ لاکھ (Shellec) حاصل ہوتی ہے۔ ان کیڑوں میں نر اور مادہ دونوں ہوتے ہیں۔ نر لگ بھگ ڈیڑھ ملی میٹر اور مادہ لگ بھگ چار ملی میٹر حجم کی ہوتی ہے۔ لاکھ کے کیڑے گرم اور مرطوب آب وہوا والے علاقوں میں کچھ مخصوص درختوں کی ٹہنیوں سے ان کا رس چوس کر اپنے جسم سے ایک سیّال مادّہ خارج کرتے ہیں جو ہوا کے زیرِ اثر سوکھ کر ہلکے پیلے رنگ کی ٹھوس بوندوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ مادہ انھی بوندوں کو گھونسلے کے طور پر استعمال کرتی ہے اور بیشمار انڈے دینے کے بعد مر جاتی ہے اور جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا نومولود کیڑوں کی اوّل خوراک مردہ ماں کا جسم ہوتا ہے۔ بعد ازاں درخت کی شاخ کا رس بطور غذا استعمال کر کے پروان چڑھتے ہیں۔ نر اور مادہ کی ملاقات ہوتی ہے اور نئی نسل وجود میں آتی ہے یہ عمل تقریباً چار ماہ تک جاری رہتا ہے۔ اس دوران درخت کی شاخوں کے چاروں طرف اور لمبائی میں پپڑی کی شکل میں خام لاکھ جمتی چلی جاتی ہے۔ شاخوں کو درخت سے کاٹ کر لاکھ کی پپڑیوں کو کھرچ کر علاحدہ کر لیا جاتا ہے۔ اس طرح حاصل ہوئی خام لاکھ کو اسٹک لاکھ (Stick lac) کہتے ہیں۔ اس کو کوٹنے اور پھٹکنے اور خس وخاشاک دور کرنے کے بعد پانی سے رگڑ کر دھویا جاتا ہے، پھر چھان کر خشک کر لیا جاتا ہے۔ اس حالت میں یہ سیڈ لاکھ (Seed lac) کہلاتی ہے۔ یہ گرم کرنے پر پگھل جاتی ہے۔ پگھلی ہوئی حالت میں سیڈ لاکھ کو مخصوص قسم کی تھیلیوں میں رکھ کر

دبا دبا کر چھانتے ہیں، جو ٹھنڈی ہونے پر قدرے بھورے رنگ کے چمکدار پتروں (Flakes) کی شکل میں آجاتی ہے۔ اب اس کو چپڑا لاکھ یا شیلک (Shellac) کہتے ہیں۔ بازار میں زیادہ تر لاکھ اسی شکل میں فروخت ہوتی ہے۔

چپڑا لاکھ یا شیلک پر نمی یا پانی کا اثر نہیں ہوتا اور یہ بڑا اچھا مانع برق (Electric non-Conductor) بھی ہے۔ یہ اسپرٹ اور اس سے مشابہ دیگر سیالات نیز سہاگے کے محلول میں حل پذیر ہے۔ یہ گرم کرنے پر پگھل جاتی ہے اور ٹھنڈا ہونے پر دوبارہ سخت ہوجاتی ہے۔ اس میں کاغذ، کپڑا، کانچ، بال وغیرہ کو اپنی سطح پر مضبوطی سے چپکائے رکھنے کی صلاحیت ہے۔ ان خصوصیات کی وجہ سے عرصۂ دراز سے لاکھ کا استعمال روزمرّہ کام میں آنے والی بیشمار اشیا میں ہوتا رہا ہے۔ مثلاً: لکڑی کے دروازے، کھڑکیوں اور فرنیچر پالش میں، بجلی کے تاروں پر مانع برق پرت چڑھانے اور دیگر برقی آلات میں موجود خالی جگہوں (Sockets) کو بھرنے میں، رنگ مار بنانے میں، نگینہ دار چوڑیوں میں، کڑے اور کنگن جیسے زیورات کے خول کو بھرنے میں، بالوں کو سیٹ کرنے والے ہیئر فکسر (Hair Fixer) بنانے میں، رجسٹرڈ یا انشیورڈ لفافوں وغیرہ کو سیل بند کرنے میں وغیرہ وغیرہ۔ اب سے پچاس ساٹھ سال قبل گراموفون ریکارڈ بھی لاکھ سے ہی تیار کیے جاتے تھے۔ چونکہ صاف شدہ لاکھ یعنی شیلک صحت کے لیے قطعی مضر نہیں اس لیے اس کا استعمال دواؤں کی گولیوں اور ٹافی وغیرہ پر ہلکی پرت چڑھا کر ان کو موسم اور جراثیمی اثر سے محفوظ رکھنے کے لیے بھی ہوتا رہا ہے۔ لاکھ کی پرت کوٹن کے ان ڈبوں کی اندرونی سطح پر بھی چڑھایا جاتا رہا ہے جن میں اشیائے خوردنی مثلاً مربے، جیلی وغیرہ سیل بند کیے جاتے ہیں۔ موجودہ دور میں لاکھ پر کچھ کیمیاوی عمل کرنے کے بعد لطیف خوشبوئیں اور حشرات الارض کو متاثر کرنے والے فیرومون (Pheromone) نامی مادے بھی تیار کیے جارہے ہیں جو ناپسندیدہ کیڑے مکوڑوں کو کنٹرول کرنے میں مؤثر ہیں۔ لاکھ کی ہلکی پرت کو کیمیاوی کھاد، یوریا وغیرہ پر چڑھا دینے سے اس کھاد کا زمین پر اثر دھیرے دھیرے ظاہر ہوتا ہے جو کہ فصل کے لیے مطلوب ہے۔

خام لاکھ (Stick lac) کی پانی سے دھلائی کے دوران اس میں موجود رنگین مادہ گھل کر الگ ہوجاتا ہے۔ اس رنگین پانی کو مختلف کیمیاوی اعمال سے گزارنے پر سیاہی مائل بنفشی رنگ کا ایک سفوف حاصل ہوتا ہے جو لاکھ ڈائی (Lac Dye) یعنی لاکھ کا رنگ کہلاتا ہے۔ انسانی صحت کے لیے غیر مضر ہونے کی بنا پر اس رنگ کو بے خوف وخطر غذا یا دوا کو خوش رنگ بنانے میں استعمال کرسکتے ہیں بلکہ 19ویں صدی کے وسط تک لاکھ کی بیشتر کاشت اسی رنگین مادے کے حصول کے لیے کی جاتی تھی کیونکہ یہ اشیائے خوردن کو خوش رنگ بنانے کے علاوہ ریشم اور اون پر بھی پختہ رنگ دیتا ہے۔ سستے کیمیاوی رنگوں کی ایجاد نے دیگر قدرتی رنگوں کے ساتھ لاکھ ڈائی کو بھی رنگوں کی دنیا سے باہر کردیا تھا۔ لیکن گذشتہ کئی دہائیوں سے کیمیاوی رنگوں کے مضر اثرات سامنے آنے پر تمام دنیا خصوصاً ترقی یافتہ ممالک میں قدرتی رنگ دوبارہ قدم جمارہے ہیں جس کی بنا پر لاکھ ڈائی کی مانگ بھی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔

ہمارے ملک ہندوستان میں قدرت کا یہ خصوصی احسان ہے کہ دنیا بھر میں جس قدر لاکھ پیدا ہوتی ہے اس کا تقریباً نصف حصہ یہاں پیدا ہوتا ہے اور اس کو تقریباً سو ممالک کو درآمد کرکے ہمارے ملک کو ہر سال کروڑوں روپئے کی آمدنی ہوتی ہے۔ لاکھ کی اس

کاروباری اہمیت کا ادراک کرتے ہوئے 1931 میں حکومت ہند (برٹش سرکار) نے ایک تحقیقاتی ادارے کی بنیاد رکھی تھی جو فی الوقت انڈین لاکھ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے نام سے رانچی (صوبہ جھارکھنڈ) میں لاکھ کی افزائش اور استعمال سے متعلق تحقیقاتی کاموں میں مصروف ہے۔ یہ دنیا کا واحد تحقیقاتی ادارہ ہے جس کا محور صرف لاکھ ہے۔ اس کے علاوہ لاکھ کی تجارت کو فروغ دینے کے لیے حکومت ہند نے 1949 میں کولکاتا میں شیلک ایکسپورٹ پروموشن کاؤنسل (SEPC) بھی بنائی تھی۔

ہندوستان میں جن درختوں پر لاکھ کے کیڑوں کی افزائش ہوتی ہے ان میں کُسُم، پلاس، بیر، گولر، انجیر، ببول اور پیپل زیادہ اہم ہیں۔ کُسُم کے درخت کی پروردہ لاکھ اپنی کوالٹی کے لحاظ سے سب سے بہتر ہوتی ہے اور کسمی لاکھ کہلاتی ہے۔ اسی لیے کُسُم کے پیڑ کو انگریزی میں لاکھ ٹری (Lac Tree) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ پلاس اور دیگر درختوں پر پیدا ہونے والی لاکھ قدرے گہرے رنگ کی ہونے کی بنا پر رنگینی لاکھ کہلاتی ہے۔ ان دونوں قسم کی لاکھ کی سال میں دو فصلیں ہوتی ہیں۔ ان میں تفریق کے لیے ان فصلوں کو اگھنی، بیساکھی، جیٹھوی اور کتکی لاکھ کہہ کر پکارتے ہیں۔ ہمارے ملک میں بیشتر لاکھ بہار، جھارکھنڈ، اڑیسہ، مغربی بنگال اور مدھیہ پردیش صوبوں میں ہوتی ہے۔ لاکھ کی افزائش یا اس کو جنگل سے اکٹھا کرنے کا کام کم و بیش تیس لاکھ قبائلی یا دیہات کے باشندے کرتے ہیں جو ان کی آمدنی کا اچھا ذریعہ ہے۔

لاکھ عرصۂ دراز سے یونانی اور آیورویدک طریقۂ علاج میں بھی مستعمل ہے لیکن ان طریقہ ہائے علاج میں لاکھ کے مواقع استعمال اور طریقۂ استعمال میں بہت فرق ہے۔ یونانی طریقۂ علاج میں صرف پانی یا کچھ جڑی بوٹیوں کے جوشاندے میں غسل دی ہوئی لاکھ ہی استعمال کی جاتی ہے۔ خام لاکھ قطعی استعمال نہیں ہوتی۔ اس سے تیار کی گئی معجون یا سفوف داخلی طور پر جسم کے موٹاپے کو کم کرنے یا اندرونی ورم کو تحلیل کرنے میں استعمال کرائے جاتے ہیں جبکہ ویدک طریقۂ علاج میں زیادہ تر خام لاکھ کو کسی تیل میں پکا کر بطور روغن یا ضماد استعمال کراتے ہیں۔ اس طرح تیار کی گئی ویدک ادویاتِ جلد کے امراض کو دور کرنے یا بخاروں کو کم کرنے لیے خارجی طور پر استعمال کرائی جاتی ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ لاکھ یا لاکھ کے کیڑے سے ابھی تک کوئی ہومیوپیتھک دوا تیار نہیں ہوئی جبکہ دیگر تمام حشرات الارض سے ہومیوپیتھک دوائیں تیار کی جاتی ہیں۔

سطور بالا میں لاکھ تیار کرنے والے انوکھے معماروں اور ان کی تعمیر سے بنی نوع انسان کو پہنچنے والے لاتعداد فوائد کی ہلکی سی جھلک پیش کی گئی ہے۔ اب ہم ربّ کائنات اور منعم حقیقی کے اس فرمان پر بھی غور کریں جس کی تکرار سورۃ رحمٰن میں ان الفاظ کے ساتھ کی گئی ہے" اور تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔"

□□□

پتہ:
Naseem Manzil, Near Madeh Ganj Police Choki,
Sitapur Road, Lucknow-2

قومی اردو کونسل کی اہم مطبوعات

اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک

مصنف: خلیل الرحمٰن اعظمی

اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک خلیل الرحمٰن اعظمی کی تحقیقی اور تنقیدی کتاب ہے۔ اس کتاب میں تعارف اور مقدمے کے علاوہ تین ابواب ہیں، جو ترقی پسند مصنفین کی تحریک، ترقی پسند ادبی سرمائے کا جائزہ اور ترقی پسند تنقید ایک تجزیاتی مطالعہ پر مشتمل ہیں۔ رشید احمد صدیقی نے جو اس مقالے کے نگراں تھے، خلیل الرحمٰن اعظمی کے تلاش و تحقیق کے طریقۂ کار، قابل قدر مواد کی فراہمی اور اس کی ترتیب اور تجزیے کی تعریف و توصیف کی ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے جو مقدمہ لکھا ہے وہ کئی معنوں میں فکر انگیز ہے۔

صفحات: 410، قیمت: -/241 روپے

تحقیق کا فن

مصنف: گیان چند جین

اردو میں اصولِ تحقیق پر اگرچہ متعدد کتابیں آچکی ہیں لیکن ان میں اس کتاب کو کئی اعتبار سے انفرادیت حاصل ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں کل 22 ابواب قائم کیے ہیں جن میں مختلف مفکرین کی آرا کے ذریعے تحقیق کی اقسام اور مقاصد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تحقیق، تنقید اور ترتیب کے اشتراک و اختلاف، موضوع کے انتخاب، محقق اور نگراں کے اوصاف، مقالے کی نوعیت، زبان و بیان کی صحت اور قطعیت، مقالے میں استعمال ہونے والے رموز و اوقاف، کتاب بندی اور فہرست سازی کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔

صفحات: 650، قیمت: -/170 روپے

آزادی کے بعد اردو طنز و مزاح

مرتب: ابوالکلام قاسمی

پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے آزادی سے تقریباً ربع صدی قبل سے نصف صدی بعد تک کے معتبر طنزیہ و مزاحیہ مضمون نگاروں کو اس کتاب میں یکجا کیا ہے، جن میں انجم مانپوری، ملا رموزی، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، شوکت تھانوی، کنھیا لال کپور، فکر تونسوی، حسنین عظیم آبادی، ابراہیم جلیس، یوسف ناظم، احمد جمال پاشا، مجتبیٰ حسین، شفیقہ فرحت اور اعجاز علی ارشد جیسے 25 قلم کاروں کی تخلیقات شامل ہیں۔ اس انتخاب سے آزادی کے بعد لکھے جانے والے مزاحیہ ادبی سرمایے کی ارتقائی منازل کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ متن اردو اور ہندی دونوں رسم الخطوں میں ہے۔

صفحات: 655، قیمت: -/457 روپے

وضاحتی کتابیات (22 جلدوں میں)

مرتب: مظفر حنفی

پروفیسر مظفر حنفی نے قومی اردو کونسل کے ایک منصوبے کے تحت سال بہ سال شائع ہونے والی کتابوں کے تعارف اور مختصر تبصرے پر مبنی ''وضاحتی کتابیات'' کل 22 جلدوں میں مرتب کی ہے۔ ہر برس کی کتابوں کا ذکر الگ الگ جلدوں میں ہے۔ موصوف نے وضاحتی کتابیات کے متعینہ اصولوں پر کاربند رہتے ہوئے کم سے کم الفاظ میں متعلقہ کتاب کے بارے میں معروضیت کے ساتھ ضروری اطلاعات فراہم کر دی ہیں، جن کے وسیلے سے محقق اور طالب علم مطلوبہ معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔

22 جلدوں کی مجموعی قیمت: -/2693 روپے

بیسویں صدی (نصف اوّل) کے اردو مصنفین

مصنفہ: سنجیدہ خاتون

اس کتاب میں متعلقہ دور کے مصنفین کے ابتدائی حالات، تعلیمی مراحل اور مشاغلِ حیات کی تفصیلات فراہم کی گئی ہیں۔ قلم کاروں میں شعرا، ناول نگار، افسانہ نگار، ڈراما نگار، محققین، ناقدین، طنز و مزاح نگار اور صحافیوں کے علاوہ سوانح، تاریخ اور اسلامی لٹریچر کی نمائندہ شخصیات شامل ہیں۔ اردو میں سوانحی حوالوں کی کتابوں کی کمی کھلتی ہے، یہ کتاب اسی خلا کو پُر کرنے کی ایک کوشش ہے جو 147 ادبا کے مختصر تذکروں پر مبنی ہے۔

صفحات: 570، قیمت -/137 روپے

کلیات حسن نعیم

مرتب: احمد کفیل

نئی غزل کے پیش روؤں میں حسن نعیم کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کی شاعری میں جو بانکپن نظر آتا ہے وہ اردو کی غزلیہ شاعری کی روایت میں انفرادیت کا حامل ہے۔ قومی اردو کونسل نے اردو کے ادبی سرمائے کے مستند متون کی اشاعت میں اہم کلاسیکی مصنفین اور بیسویں صدی کے معتبر تخلیق کاروں کی کلیات شائع کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے ''کلیاتِ حسن نعیم'' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں حسن نعیم کی تمام شعری تخلیقات تاریخی ترتیب سے جمع کر دی گئی ہیں۔

صفحات: 335، قیمت: -/185 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

Date of Publication : 24/04/2009
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

URDU DUNIYA Monthly, May 2009, Vol. 11, Issue: 5
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India

قومی اردو کونسل کا معتبر علمی جریدہ

"فکر و تحقیق"

جو ہر سہ ماہی پر دعوت فکر دینے والے تحقیقی مواد کے ساتھ منظر عام پر آتا ہے

جس میں شائع ہونے والے مضامین کا خاصہ ہے معلوم حقائق کی چھان بین اور نا معلوم حقائق کی دریافت

صرف ایک جریدہ نہیں، ماضی کے اندوختوں اور حال کے

اکتسابات سے مستقبل کو مالا مال بنانے کی ایک تحریک

خود بھی اس رسالے کے خریدار بنیں اور دوسروں کو بھی اس کی خریداری کا مشورہ دیں۔

ہندوستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت : 100 روپے، فی شمارہ 25 روپے

زر سالانہ بذریعہ ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

[illegible] خریدار صرف ڈرافٹ یا منی آرڈر [illegible]

غیر ملکی خریداروں کے لیے

ممالک	سادہ ڈاک آرڈینری	سادہ ڈاک رجسٹرڈ	ہوائی ڈاک آرڈینری	ہوائی ڈاک رجسٹرڈ
پاکستان	172 روپے	184 روپے	256 روپے	316 روپے
نیپال	160 روپے	228 روپے	292 روپے	360 روپے
بنگلہ دیش	146 روپے	174 روپے	238 روپے	306 روپے
دیگر ممالک	160 روپے	220 روپے	336 روپے	396 روپے

Printed and Published by Dr. Abu Bakar Abbad, PPO, NCPUL on behalf of NCPUL West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110066, and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 on 70 GSM Paper produced by TNPL   Editor: Dr. Abu Bakar Abbad, Tel: 26103381, 26103938